بیشتر مضامین ادب و شعر کے بارہ میں ترقی پسند اور نئے ادب اور اس کے ادیبوں کے خیالات و نظریات اور انکی ادبی و شعری حیثیت پر تنقید و اصلاح سے متعلق ہیں، فاضل مصنف صاحب فکر و نظر ادیبوں میں ہیں، وہ محض نقال نہیں، بلکہ ادبیات کے متعلق اپنا مستقل نقطۂ نظر رکھتے ہیں، ان میں جدت و قدامت کا نہایت معتدل امتزاج ہے، وہ اپنے پرانے ادبی سرمایہ کو بھی قابل قدر سمجھتے ہیں اور نئے ادبی تقاضوں سے بھی غافل نہیں، اور ان دونوں کے صالح عناصر کے لیے ان کا دل کشادہ اور دامن وسیع ہے، اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے ترقی پسند ادب اور اس کے ادیبوں کے افکار و تصورات اور ان کے ادبی ذخیرہ کا جائزہ لیا ہے، ان پر تنقید کی ہے اور اس بارہ میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں، یہ مضامین فکری اور ادبی دونوں حیثیتوں سے نہایت سنجیدہ، متوازن اور مبصرانہ ہیں، جن سے ادبیات میں صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے مگر اب خود ترقی پسند ادیبوں کو اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے، اور کسی حد تک انھوں نے اسکی اصلاح بھی کر لی ہے، چنانچہ ترقی پسند ادیبوں کا سنجیدہ اور صاحب نظر طبقہ نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کی جدتوں اور بدعتوں کو پسند نہیں کرتا، پھر بھی اس کی بنیادی خرابی یعنی اس کے اشتراکی لٹریچر کی نقالی اور اندھی تقلید بڑی حد تک اب بھی قائم ہے، جو نا قابل اصلاح ہے، اس لیے کہ اس تحریک کی بنیاد ہی اسی پر ہے، پھر بھی اس میں متانت و سنجیدگی آگئی ہے، بہرحال مصنف کے یہ سب مضامین فکری اور ادبی دونوں حیثیتوں سے ترقی پسند ادیبوں کے مطالعہ اور استفادہ کے لائق ہیں،

"م"

نمبر ۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۸ء جلد ۸۲

مضامین

شذرات

آج کل مسلمانوں کو ستانے اور بدنام کرنے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ ان کو فرقہ پرست اور پاکستانی کہہ دیا جائے، اس کے بعد پھر کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی، اور اس حربہ کی زد سے اشخاص سے لیکر جماعتوں اور اداروں تک کوئی بھی محفوظ نہیں، ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے مسلمانوں کی دوسری چیزوں کی طرح مسلم یونیورسٹی بھی فرقہ پرستوں کی نگاہ میں کھٹک رہی ہے اور وہ اس کو نقصان پہنچانے کے لیے طرح طرح کے الزام لگاتے رہتے ہیں، خصوصاً جب سے ہندو یونیورسٹی کی بے عنوانیاں اور اس کے شرمناک واقعات بے نقاب ہوئے ہیں اور حکومت ہند نے اس کو اپنے انتظام میں لے لیا ہے، اس کی خفت میں مسلم یونیورسٹی کی مخالفت اور بڑھ گئی ہے، اور اس کے خلاف روز ایک نہ ایک افسانہ تراشا جاتا ہے، چنانچہ ابھی حال میں بمبئی کے انگریزی اخبار بلٹز نے جو اپنی عجوبہ پسندی کے لیے مشہور ہے، یونیورسٹی کے خلاف ایک نہایت زہریلا مضمون لکھا ہے جس میں اسکو فرقہ پرست اور پرو پاکستانی ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کے الزام لگائے گئے ہیں، ہندو مہاسبھا کے جنرل سکریٹری دیش پانڈے نے اپنے ایک تازہ بیان میں حکومت سے یہاں تک مطالبہ کیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی بند کر دیجائے یا اس کی تحقیقات کے لیے کمیشن مقرر کیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بشیر حسن صاحب زیدی نے ایک پریس کانفرنس میں بلٹز کے تمام الزاموں کا مدلل جواب دیا ہے، اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے اعداد و شمار سے اسکی پوری تردید اور یونیورسٹی

کی سیکولر پالیسی کی وضاحت کی ہے، اصولی اور صحیح جواب تو یہی ہے جو انھوں نے دیا ہے، لیکن اس کے دوسرے جواب بھی ہیں، جو وہ نہیں دے سکتے تھے، وہ یہ کہ علی گڈھ کالج اصل میں مسلمانوں کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا، اور وہ محض تعلیمی نہیں بلکہ مسلمانوں کا تہذیبی ادارہ بھی تھا جس کا مقصد ان کی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت تھی، لیکن اس حیثیت سے ہمیشہ سیکولر تھا کہ اس کے دروازے ہر فرقہ کے لیے کھلے ہوئے تھے، چنانچہ ہر زمانہ میں یہاں ہندو طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں سے بعض مشاہیر پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے وہ آج بھی سیکولر ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔

مگر اس حیثیت کے علاوہ وہ ہر حیثیت سے ایک مسلم ادارہ ہے اور اس کو مسلم یعنی مسلمانوں کی تہذیبی و ملی روایات کا نمایندہ رہنا چاہیے، جہاں مسلمان طلبہ اور اساتذہ کو زیادہ سہولتیں حاصل ہوں، ہندوؤں کے تو بہت سے کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، ایک ہندو یونیورسٹی پر کیا موقوف ہے، ہندوستان میں جتنی یونیورسٹیاں بھی ہیں، وہ عملاً ہندوؤں کی ہیں، جن میں مسلمان طلبہ اور اساتذہ کو مختلف قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں، خصوصاً سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم میں تو مسلمانوں کا گذر ہی نہیں ہے، اس لیے اگر مسلم یونیورسٹی میں بھی مسلمان طلبہ اور اساتذہ کے لیے سہولتیں نہ ہوں تو پھر وہ کہاں جائیں،

دوسرے مسلم یونیورسٹی انڈین یونین کی سیکولرزم کا ایک بڑا نشان اور اسلامی ملکوں کو دکھانے کے لیے اس کا عملی نمونہ ہے، چنانچہ ان ملکوں کا جو بڑا آدمی بھی ہندوستان آتا ہے اس کو نشان کا یہ ہاتھی ضرور دکھایا جاتا ہے، اور وہ انڈین یونین کی سیکولرزم اور مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے حسن سلوک کا اچھا اثر لیکر جاتا ہے، اگر اس کو اس معنی میں سیکولر بنا دیا جائے کہ اس میں مسلمانوں کی کوئی خصوصیت باقی نہ رہے تو پھر اسلامی ملکوں کے نمایندوں کو کیا چیز دکھائی جائیگی اور وہ اس کا کیا اثر لینگے، اسلیے نہ صرف مسلمانوں کے نقطۂ نظر بلکہ

حکومت کے مصالح کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں کا خصوصی ادارہ اور ان کی تہذیب و روایات کا مظہر برقرار رکھا جائے، افسوس تو اسی کا ہے کہ اب یہ اثرات بھی مٹتے جاتے ہیں، کاش اسکے ارباب حل و عقد کو اسکی توفیق ہوتی کہ وہ یونیورسٹی میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے، یہ یاد رہے کہ جس دن مسلم یونیورسٹی میں اسکی پرانی تہذیبی خصوصیات باقی نہ رہیں گی اسمیں مسلمانوں کیلیے کوئی کشش اور اسکی کوئی اہمیت باقی نہ رہیگی اور وہ بھی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح محض ایک تعلیمی ادارہ بن کر رہ جائے گی،

اس موقع پر گاندھی جی کا ایک قابل تقلید نمونہ لکھے بغیر آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا، ایک زمانہ میں جب "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی مالی حالت زیادہ خراب تھی گاندھی جی کی تحریک پر سیٹھ جمنا لال بجاج یا کوئی اور ہندو دولتمند اس شرط پر مدد دینے کے لیے تیار ہو گئے کہ جامعہ کے نام سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیا جائے، گاندھی جی نے اسکی سخت مخالفت کی اور کہا جامعہ کو نہ صرف نام کے لحاظ سے بلکہ عملاً بھی اسلامیہ رہنا چاہیے کہ ہندوستان میں ایک تعلیم گاہ تو ایسی رہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی تعلیم و تربیت کے طریقہ اور اسکے عملی نمونہ کا مطالعہ کرنا چاہے تو جامعہ میں دیکھ سکے، ایک گاندھی جی تھے جنکو جامعہ ملیہ کی "اسلامیت" پر اصرار تھا، ایک ان کے نام لیوا ہیں جن کو اسلام اور مسلم کا لفظ تک گوارا نہیں معلوم نہیں، اب خود جامعہ والوں کو گاندھی جی کے اس نقطۂ نظر سے کہاں تک اتفاق اور اس کا کہاں تک پاس ہے،

جو لوگ مسلم یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں وہ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں کہ ہندو یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ اور اساتذہ کی تعداد کتنی ہے، بلکہ ہندوؤں میں بھی ہریجن طلبہ کیساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے، ہندو یونیورسٹی تو خیر ہندوؤں کی ہے، اگر ان یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ کے اعداد و شمار فراہم کیے جائیں جو مشترک کہلاتی ہیں تو ان کی سیکلرزم اور غیر فرقہ واریت کا سارا بھرم کھل جائیگا، اگرچہ زیدی صاحب نے اس الزام کی پوری تردید کی ہے کہ انجینیرنگ کالج کے طلبہ کی بڑی تعداد پاکستان چلی جاتی ہے، لیکن اگر اسکو صحیح بھی

مان لیا جائے تو اس میں طلبہ کا کیا قصور، جب ہندوستان میں مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے تقریباً بند ہیں تو انکو جہاں بھی ملازمت ملنے کی امید ہوگی چلے جائیں گے، اسمیں حکومت کا قصور ہے یا مسلمان طلبہ کا، مشرقی و مغربی پاکستان کو ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کا الزام اتنا مضحکہ خیز ہے کہ اسکی تردید کی بھی ضرورت نہ تھی، اگر کل کو کوئی صاحب یہ الزام لگا دیں کہ ہندوستان کے مسلمان ہمالیہ کو ڈھکیل کر پاکستان لیجانا چاہتے ہیں تو اسکا جواب دیا جائیگا؟

حکومت ہند کی وزارت داخلہ نے اردو کے بارہ میں جو ہدایت نامہ جاری کیا ہے اور اسمیں اسکے لیے جن حقوق کی سفارش کیگئی ہے اسمیں قریب قریب وہ سب باتیں آگئی ہیں جنکا اردو کے لیے مطالبہ کیا جاتا ہے، مگر اسکی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اسکی قانونی حیثیت نہیں بلکہ صرف ایک "سرکاری ہدایت نامہ" کی ہے جسکو صوبائی حکومتیں مختلف بہانوں سے نظر انداز کر سکتی ہیں، اگر یہی حقوق صدر کے حکم یا پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ذریعہ ملتے تو انکی حیثیت آئینی ہو جاتی، دوسرے اس میں علاقائی زبان کی تصریح سے گریز کیا گیا ہے، مگر اس خامی سے قطع نظر جہانتک ممکن ہے، اس کو موثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اور پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم ڈاکٹر تریگونا سین نے اسکی تائید مزید کے لیے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کے نام جو خطوط لکھے ہیں، ان کو ان پر عمل کرنے کی پوری تاکید ہے، اگر ان ہدایات پر واقعی عمل کیا جائے تو اردو والوں کا مطالبہ بڑی حد تک پورا ہو جائیگا، ورنہ ان کی حیثیت خوشنما الفاظ سے زیادہ نہیں ہے۔

اتر پردیش کی حکومت نے خلاف توقع ان سفارشوں سے پورا اتفاق کیا ہے مگر اس کا یہ دعویٰ کھٹک پیدا کرتا ہے کہ یہ سفارشیں اسکی پالیسی کے عین مطابق ہیں اور وہ ان میں سے چار حقوق کو پہلے سے مانتی چلی آرہی ہے، اردو کے بارہ میں اسکی پالیسی ایسی کھلی ہوئی ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، اسلئے سوال زبانی ماننے کا نہیں بلکہ عمل کا ہے، اور عمل کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہے، اسکے بعد یہ دعویٰ کتنا عجیب و غریب ہے، یہ عذر بھی کس قدر لغو ہے کہ

حکومت تو اردو کے بارہ میں احکام جاری کرتی ہے مگر ماتحت حکام اس پر عمل نہیں کرتے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حکومت کے دلی منشا کو سمجھتے ہیں، ورنہ کبھی مخالفت کی جرأت نہ کرتے، آخر دوسرے انتظامی معاملات میں ان کو مخالفت کی جرأت کیوں نہیں ہوتی، بہرحال دیکھنا ہے آیندہ حکومت کیا کرتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب تک نئی فضا سے متاثر عہدہ داروں کو اس کا یقین نہ ہو جائیگا کہ اردو بھی قانوناً ان صوبوں کی ایک زبان ہے خواہ وہ کسی درجہ کی سہی اور حکومت بھی اس کو قائم و برقرار رکھنا چاہتی ہے، اس وقت تک اسی قسم کی دشواریاں پیش آتی رہیں گی، اس کا واحد حل یہی ہے کہ اردو کو آئینی طور پر علاقائی زبان تسلیم کر لیا جائے یا کم از کم اس کے لیے جن حقوق کی سفارش کی گئی ہے ان کو قانونی شکل دیدی جائے، اس کے بغیر اردو کا آئینی تحفظ نہیں ہو سکتا، خصوصاً اس صوبہ میں جس کے وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم دونوں کی اردو نوازی اظہر من الشمس ہے، بلکہ اب تو اس معاملہ میں وزیر تعلیم کا نمبر وزیر اعلیٰ سے بھی بڑھ گیا ہے، اس بارہ میں انکے جذبات کا پتہ انکے ان تازہ بیانات سے بھی چلتا ہے جو انھوں نے اردو کی علاقائی حیثیت کے بارہ میں دیے ہیں، ایسی حالت میں مرکزی حکومت کی ہدایات پر عمل کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

مرکزی حکومت اردو کے جن پانچ حقوق کو مانتی ہے آخر ان کو قانونی شکل دینے میں کیا تامل ہے، بجز اس کے کہ وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتی یا اس کو صوبائی حکومتوں کی مخالفت کا خطرہ ہے، اور محض زبانی سفارش میں صوبائی حکومتیں بھی مخالفت نہ کرینگی، اور اردو والوں کی بھی تالیف قلب ہو جائیگی۔ بہرحال ان خامیوں کے باوجود مرکزی حکومت کی ہدایات سے اردو کا قدم کچھ نہ کچھ آگے ضرور بڑھا ہے، اس سے اردو کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور مرکزی حکومت کی زبان سے اسکی حیثیت اور حقوق کی تصریح ہو گئی، اردو والوں کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور آیندہ کیلیے کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

مقالات

مَدارِجِ سُلوک

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

تصفیۂ قلب

تصفیۂ قلب سے مراد یہ ہے کہ آئینۂ قلب کو ہموم و غموم دنیوی، میل ابنائے دنیا، حب دنیا و اندیشۂ مالایعنی سے پاک و صاف کیا جائے، قلب کے دو معنی ہیں، ایک معنی کی رو سے قلب گوشت کا وہ لوتھڑا ہے جو صنوبری شکل کا ہوتا ہے، اور سینے کے بائیں طرف رکھا گیا ہے، اس کے اندر تجویف ہے، اس تجویف میں خون ہے، اور یہی روح کا منبع سمجھا جاتا ہے، اس قلب سے ہمیں بحث نہیں، یہ اطباء کا معروض بحث ہے، یہ دل بہائم میں بھی موجود ہے بلکہ مردے کے جسم میں بھی یہ موجود ہوتا ہے، قلب کے دوسرے معنی بھی ہیں، اس معنی میں وہ ایک لطیفۂ ربانی روحانی ہے، اس لطیفہ کو قلب جسمانی سے تعلق یا لگاؤ ہوتا ہے، یہی لطیفۂ ربانی حقیقت انسان ہے، اسی کو ادراک، علم و عرفان ہوتا ہے، یہی ہر خطاب کا مخاطب، عتاب کا معاتب، عقاب کا معاقب ہوتا ہے، اور اس کا تعلق لحم صنوبری سے ویسا ہی ہے جیسا کہ عرض کا جسم سے،

وصف کا موصوف سے متمکن کا مکان سے متصل آلہ کا آلہ سے ، اسی قلب کو عرش اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے ا
اور سلوک میں اسی قلب کا تصفیہ مقصود ہے !

تصفیہ قلب کے لیے شیوخ طریقت اس سنۃ اللہ کو پیش نظر رکھنے کی تاکید کرتے ہیں کہ حکیم مطلق کی حکمۃ بالغہ کا اقتضایہ ہے کہ جس قدر انسان اسباب ظاہرہ دنیویہ میں گرفتار رہتا ہے اور مادیات محسوسہ کی طرف متوجہ رہتا ہے ، اسی قدر وہ آفات و آلام ، پریشانی باطن ، تردد خاطر و اضطرار نفس و غفلت قلب میں مبتلا رہتا ہے ، اور جس قدر زیادہ پرورش بدن میں مصروف رہتا ہے ، تن پروری و ظاہر آرائی میں منہمک ہوتا ہے ، اسی قدر قلب کے احوال میں خرابی پیدا ہوتی ہے ، اور قوائے روحیہ میں ضعف نمودار ہوتا ہے ، اور قلب کی صفائی و نورانیت میں کمی پیدا ہوتی ہے اور کدورت و ظلمت میں زیادتی ہوتی ہے ۔ اسی لیے نفس کشی و ریاضت و مجاہدہ سلوک کے شرائط سے ہیں اور ترک ماسوی لوازم طریقت سے ہے ۔

بات یہ ہے کہ جاہل اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہوتا اور اسی گوشت و پوست کو اپنی ذات قرار دے لیتا ہے ، اور اپنے قلب کی بساطت و تجرد سے غافل ہوتا ہے ۔ اور تن پروری میں مشغول رہتا ہے ، اور نفس کے مرادات کو پورا کرنے میں مصروف رہتا ہے ، اور طبیعت کی خواہش کے مطابق مشتہیات حسیہ کے حصول میں لگا رہتا ہے ۔ اور زندگی کو جو سرمایۂ آخرت ہے ، دنیائے ناپائیدار کی طلب میں ضائع کر دیتا ہے ، اور معاد کی حقیقت سے بالکل غافل رہتا ہے ، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نفس کی حکم برداری میں لگ کر اس کو بالآخر تباہ کر دیتا ہے ، اور نفس اپنی حکمرانی سے اس کو ہلاک کر دیتا ہے ! اسی قسم کے جاہلوں کے متعلق کہا گیا ہے ،

فَتَنْتُمْ اَنْفُسَکُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْکُمُ الْاَمَانِیُّ

تم نے اپنے نفس کو بچلا دیا اور راہ دیکھتے رہے ، اور دھوکے میں پڑے رہے ، اور بہک گئے

حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ وَغَرَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ (حدید - ۱۴)

اپنے خیالوں پر ، یہانتک کہ آ پہنچا حکم اللہ کا اور تم کو بہکا دیا اللہ کے نام سے اس دغاباز نے

بعض مفسرین نے کہا ہے فتنتم انفسکم اے بالشہوات واللذات ، وتربصتم اے بالتوبۃ ، وارتبتم اے تشککتم حتی جاء امر اللہ اے الموت وغرکم باللہ الغرور
اسی لیے تعجب کیا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر جو دار الخلود پر ایمان رکھتا ہے ، اور دار الغرور کے لیے کوشاں ہے :

عَجَبًا کُلَّ الْعَجَبِ لِلْمُصَدِّقِ بِدَارِ الْخُلُوْدِ وَھُوَ یَسْعٰی لِدَارِ الْغُرُوْرِ !

تصفیۂ قلب اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ حب دنیا قلب سے نہ نکلے ، دنیا بذاتہ مذموم نہیں کیونکہ یہ مزرعۂ آخرت ہے ، اور اس مقصد کے حصول کا وسیلہ ہے ، دنیا سے محبت و تعلق مذموم ہے ، یہی معنی ہے اس قول نبوی کے : حب الدنیا راس کل خطیئۃ[1] !! دنیا میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ انسان کو اعلیٰ علیین تک پہنچا دے ، یا اسفل سافلین تک گرا دے ، جو شخص دنیا کو راہ دین کے آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے ، اور محض حظوظ جسمانی کے استیفاء پر اپنی ہمت کو مرکوز نہیں کرتا ، اور اذھبتم طیبا تکم فی حیاتکم الدنیا ، ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم کی وعید پر نظر رکھتا ہے اور وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ پر عمل کرتا ہے وہ صورت کے لحاظ سے تو دنیا کا رہنے والا ہے لیکن اپنے قلبی تعلق کے لحاظ سے وہ ملاء اعلیٰ میں زندگی بسر کر رہا ہے ، وہ خدا کے لیے زندہ ہے نہ کہ ہوی کے لیے ، دنیا اس کے واسطے صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے عظیم الشان معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے ، اور لسان نبوت سے اسکی تعریف یوں کی گئی ہے : نعم المال الصالح للرجل الصالح ، صالح کا مال بھی کیسا اچھا مال ہے !

[1] رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن حذیفہؓ مرفوعاً

بات اتنی ہی ہے جو رومیؒ نے کہی تھی:

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　نے لباس و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کی محبت اگر قلب میں نہ ہو، اس سے بے تعلقی قلب کا حال بن جائے اور حق تعالیٰ کی محبت اس کی جگہ لے لے اور وجہ اللہ سے لذت نظر حاصل ہونے لگے اور "شوق لقا" اس کے قلب میں پیدا ہو جائے تو حضرت سلیمانؑ کی طرح باوجود ملک و مال کے وہ اپنے کو مسکین کہہ سکتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت رومی کی زبان سے سنو:

چیست دنیا از خدا غافل شدن　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

چونکہ مال و ملک را از دل براند　　زاں سلیمانؑ خویش را مسکیں نخواند

ہر کہ از دیدار برخوردار شد　　ایں جہاں در پیش او مردار شد

ایں جہان و اہل او بے حاصل اند　　ہر دو اندر بیوفائی یک دل اند

می نماید نور نار و نار نور!　　ورنہ دنیا کے بدی دار الغرور

بند بگسل باش آزاد اے پسر　　چند باشی بند سیم و بند زر

یک دو روزے چہ کہ دنیا ساعت است　　ہر کہ ترکش کرد اندر راحت است

معنی الترک راحۃ گوش کن　　بعد ازاں جام بقا را نوش کن

ترک دنیا سے مراد دنیا کی محبت کا قلب سے منقطع ہو جانا ہے، یہ نہ ہو تو کسی قسم کی ریاضت بھی مفید نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ برہان الدین قدس سرہٗ اپنی تالیف ثمرات الحیات میں ایک مثال کے ذریعہ اس مفہوم کو واضح کرتے ہیں: فرض کرو کہ ایک کنوئیں میں چوہا گرا اور مر گیا، پانی میں بدبو پیدا ہو گئی، کوئی شخص اگر چاہے کہ کنوئیں کے پانی کو پاک کرے تو اس کو چاہیے کہ سب سے پہلے اس چوہے کی لاش کو کنوئیں سے نکال لے، اور پھر چند ڈول پانی کے کنوئیں سے

نکال کر پھینک دے، پانی پاک ہو جائے گا، سڑے ہوئے چوہے کو کنوئیں میں رکھ کر کنوئیں کا پانی کتنا بھی نکالا جائے، کنواں ناپاک ہی رہے گا اور بدبو باقی! اسی طرح دنیا کی محبت قلب میں رکھ کر ساری ریاضت فضول ثابت ہوتی ہے[1]! قلب کا جو مقصود ہوتا ہے، وہی اس کا معبود ہوتا ہے! اسی لیے کہا گیا ہے کہ "ہر چہ دلبند تست خداوند تست" و "ہر چہ در بند آنی بندہ آنی!" جب تک کہ قلب کے ورق کو نقوش پراگندہ سے صاف نہیں کیا جاتا، جو حب دنیا کے اثرات ہیں، قلب کا تصفیہ ممکن نہیں:

خاطرت کے رقم فیض پذیرد ہیہات　　مگر از نقش پراگندہ ورق سادہ کنی

صحابۂ کرام و تابعین عظام تصفیۂ قلب کے لیے علاوہ اور اعمال و اشغال کے موت ہادم اللذات کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ اور حق تعالیٰ نے فرماں برداروں کے واسطے جو ثواب اور نافرمانوں کے لیے جو عذاب مقرر کیا ہے اس کو ہمیشہ ذہن میں مستحضر رکھتے اور اس طرح ظاہری لذتوں کا شوق ان کے دل سے اٹھ جاتا تھا، ہمیشہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے اور اس پر غور و تدبر کرتے اور وعظ اور جس حدیث سے دل نرم ہوتا ہے، اس کو سنا کرتے تھے۔

قرآن حکیم میں ذم دنیا کی جو آیتیں ہیں ان پر تصفیۂ قلب کے لیے نہایت مفید ہیں، ہم چند آیات کا یہاں ذکر کرتے ہیں تاکہ سالک ان پر غور کیا کرے۔ اور اپنے قلب کے آئینہ کو ہموم و غموم دنیوی، حب دنیا اور اندیشۂ مالایعنی سے پاک و صاف کر لے اور صحابہ و تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے طریقے سے اپنے سلوک کو طے کرے۔

حق تعالیٰ نے متاع دنیا کو "قلیل" قرار دیا ہے اور آخرت کو متقیوں کے لیے "خیر" کے لفظ سے یاد کیا ہے! افسوس ہے کہ یہ قلیل و ذلیل، رب جلیل کے خیر کثیر کے سد راہ ہو جائے اور

[1] منقول از جواہر غیبی مولفہ سید مظفر علی شاہ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۷ء ص ۳۵۷

اس نمو بے بود سے اس بود بے نمود کا دروازہ بند ہو جائے!

قل متاع الدنیا قلیل   کہہ کر فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے

والآخرۃ خیر لمن اتقیٰ ولا   پرہیزگار کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ایک

تظلمون فتیلا (نساء ۔ ۷۷)   تاگے کے برابر،

حیات دنیا کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے اور دار آخرت کو سرمایۂ عیش و عشرت، اول الذکر ہوا پرستوں کا مقصود ہے، اور ثانی الذکر حق پرستوں کا، ایک شر محض ہے دوسرا خیر محض:

وما الحیوۃ الدنیا الا لعب و   اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل

لھو و للدار الآخرۃ خیر للذین   اور جی بہلانا اور آخرت کا گھر بہتر ہے

یتقون (سورہ انعام ۔ ۳۲)   پرہیزگاروں کے لیے،

جس متاع دنیا کو قلیل کہا گیا ہے، اور جس میں انہماک لہو و لعب قرار دیا گیا ہے، جانتے ہو وہ کیا ہے؟ یہی حب زن و فرزند، زر و سیم کے انبار، زرق برق سواریاں اور کھیتیاں اور چوپائے اور مویشی! اور ان سے تعلق خاطر:

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ   فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی

مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ   محبت نے جیسے عورتیں اور بیٹے اور خزانے

الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ   جمع کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے

وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعَامِ وَ   نشان لگائے ہوئے اور مویشی اور کھیتی

الْحَرْثِ ۭ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ   یہ فائدہ اٹھانا ہے دنیا کی زندگی میں

الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ   اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانا،

(آل عمران ۔ ۱۴)

ترک شہوتہاست حور و خانۂ پرداز قصور   در بہشت اہل دل حور و قصور دیگر ست

دولت دنیا گوارا نیست بر روشندلاں   تاج زرتا ہست بر سر شمع را گریاں کند!

ان شہوتوں اور لذتوں میں گرفتار ہو کر حق تعالیٰ کو جو فراموش کر دیتے ہیں، ان کو قیامت کے دن اسی طرح فراموش کر دیا جائے گا جس طرح وہ آج یوم آخرت کو بھلائے ہوئے ہیں اور لقائے رب سے بے پروا ہیں

الذین اتخذوا دینھم لھوا   جنھوں نے ٹھہرایا اپنا دین تماشا اور کھیل اور

ولعبا و غرتھم الحیوۃ الدنیا   دھوکے میں ڈالا ان کو دنیا کی زندگی نے

فالیوم ننسٰھم کما نسوا   سو آج ہم ان کو بھلا دیں گے، جیسا انھوں نے

لقاء یومھم ھذا   بھلا دیا اس دن کے ملنے کو،

اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے بقا کو جاننے کے باوجود دنیا ہی کے متاعِ قلیل کے حصول پر اپنی ہمت مرکوز کرتا ہے، اور آخرت کے خیر کثیر سے بے پروا ہو جاتا ہے، اور سراب دنیا کی نمایش کو جان کر بھی اسی کے نظارہ سے خوش اور راضی رہتا ہے،

ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من   کیا خوش ہو گئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو

الآخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا   چھوڑ کر، سو کچھ نہیں نفع اٹھانا دنیا

فی الآخرۃ الا قلیل   کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر

(توبہ ۔ ۶)   بہت تھوڑا،

دیدم ایں چشمۂ ہستی کہ جہانش خوانند   ایں قدر آب کز دست تواں شست نداشت

جانتے ہو کہ قرآن حکیم نے دنیا کی زندگی کی مثال کیا دی ہے؟ حیاتِ دنیا گویا وہ پانی ہے

جو آسمان سے برسا ہے، اور پھر اس سے زمین کا سبزہ رلا ملا نکلا، جب زمین نے اس پانی اور سبزے سے زیب و زینت حاصل کی، اور لوگوں کو گمان ہوا کہ یہ زمین ہمارے ہاتھ آگئی، ناگاہ زمین آفریں کا فرمان آپہنچا، کسی دن یا کسی رات، اور اس نے تمام زیب و زینت کا ایسا صفایا کر ڈالا گویا یہاں ایک تنکا بھی نہ اگا تھا! بیشک اسی طرح انسان کی زندگی ہے، خواہ کتنی ہی حسین و تر و تازہ نظر آئے اور بے وقوف لوگ اس کی رونق و دلربائی پر مفتون و فریفتہ ہو کر اصل حقیقت کو فراموش کر دیں، لیکن اس کی یہ شادابی اور زینت و بہجت چند ہی روزہ ہے، اور بہت جلد زوال و فنا کے ہاتھوں نسیاً منسیاً ہو جائے گی!

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

انما مثل الحیوۃ الدنیا کماءٍ	دنیا کی زندگانی کی وہی مثل ہے جیسے
انزلناہ من السماء فاختلط بہ	ہم نے پانی اتارا آسمان سے پھر رلا ملا
نبات الارض مما یاکل الناس	نکلا اس سے سبزہ زمین کا جو کہ کھائیں
والانعام حتی اذا اخذت	آدمی اور جانور یہاں تک کہ جب پکڑ لی
الارض زخرفھا وازینت	زمین نے رونق اور مزین ہو گئی اور
وظن اھلھا انھم قادرون	خیال کیا زمین والوں نے کہ یہ ہمارے
علیھا اتٰھا امرنا لیلا ونھاراً	ہاتھ لگے گی، ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم
فجعلنا حصیدا کان لم تغن	رات کو یا دن کو، پھر کر ڈالا اس کو کاٹ کر
بالامس کذٰلک نفصل الاٰیٰت	ڈھیر، گویا کل یہاں نہ تھی آبادی، اسی طرح
لقوم یتفکرون	ہم کھول کر بیان کرتے ہیں نشانیوں کو
(یونس - ۲۴)	ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں۔

دنیوی زندگی کی اس حقیقت سے واقف ہو کر بھی اگر ہم اس سے خوش و راضی ہوں اور اس سراب کے نظارہ میں رہ کر لذتِ آب (آخرت کی نعمتوں) سے محروم ہو جائیں تو ہم پر افسوس ہے۔

دنیا چہ بود اے احباب است
یا غرفۂ دود یا سراب است

آنکس کہ چنیں ندید او را
در فکر ہمیشہ دل کباب است

وَفَرِحُوا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَا	اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا
الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ	کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے
اِلَّا مَتَاعٌ (رعد - ۲۶)	مگر متاع حقیر،

یہ دنیا آخرت کا مزرعہ ہے، یہاں جو کچھ بویا جاتا ہے، وہاں کاٹا جاتا ہے، جو اس خاکدان میں راسخ الایمان رہے گا اس کو آخرت میں بھی ثبات و ایقان حاصل ہوگا، اور جو اس کہنہ رباط میں تہی دست رہا عمل و ایمان کے اعتبار سے آخرت میں بھی سراسیمہ و پریشان رہے گا۔

پاک شو تا ز اہل دیں گردی
آنچناں باش تا چنیں گردی

یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ	مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو
الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی	مضبوط بات سے دنیا کی زندگی میں اور
الْاٰخِرَةِ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ	آخرت میں اور راہ بھلا دیتا ہے، اللہ
وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (ابراہیم - ۲۷)	بے انصافوں کو اور کرتا ہے اللہ جو چاہے۔

متاع دنیوی پر نظر کرنے اور اس کی طمع کرنے سے پیغمبر کو بھی منع کیا گیا ہے، دوسروں کی کیا مجال ہے کہ نگارخانۂ دنیا کا نظارہ کرے اور اس کی تمنا میں رہے! یہ چند روزہ بہار ہے جس کے ذریعہ امتحان مقصود ہے۔

ہمہ اندر زمن بتو این است
کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا	اور مت پسار اپنی آنکھیں اس چیز پر جو
بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ	فائدہ اٹھانے کو دی ہم نے ان طرح
الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ	طرح کے لوگوں کو رونق دنیا کی زندگی کی، انکے
رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ	جانچنے کو اور تیرے رب کی دی ہوئی روزی
(طٰہٰ - ۱۳۱)	بہتر ہے اور بہت باقی رہنے والی،

آج جو کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے وہی اس حیات دنیوی کا سرمایہ ہے، اور ہم اپنے جہل کی وجہ سے اس کے رنگ و بو پر فدا ہیں، اور جو کچھ حق تعالیٰ کے ہاں ہے "اور خیر و ابقیٰ" ہے، اپنی غفلت کی وجہ سے ہم اس سے بیزار ہیں! یہ ہے ہماری سمجھ جس پر ہمیں رونا چاہیے۔ اور یہ ہے ہماری دیدہ و دادیدہ جس پر ہمیں آنسو بہانا چاہیے،

ولا تا کے دریں زنداں فریب ایں و آں بینی	یکے زیں راہ ظلمانی بروں شو تا جہاں بینی
وَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ	اور جو تم کو ملی ہے کوئی چیز سو فائدہ اٹھالینا
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا وَمَا	ہے دنیا کی زندگی میں اور یہاں کی رونق
عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ!	ہے اور جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے اور
(قصص - ۶۰)	باقی رہنے والا،

آخرت فراموش احمق دنیا کے فوت ہوجانے پر افسوس کرتے ہیں اور جب ان کی نظر کسی دولتمند پر پڑتی ہے، تو خواہش کرتے ہیں کہ کاش یہ جاہ و حشم ہمیں نصیب ہوتا، اور عقبیٰ دوست عاقل ثواب آخرت پر اپنی نظر جماتے ہیں اور دنیا و ما فیہا کو آخرت کے مقابلہ میں ناچیز محض قرار دیتے ہیں، ع

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ	کہنے لگے جو لوگ طالب تھے دنیا کی زندگانی
الدُّنْيَا يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ	کے اے کاش ہم کو ملے جیسا کچھ ملا ہے قارون
قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ	کو بیشک اسکی بڑی قسمت ہے اور بولے
وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ	جن کو ملی تھی سمجھ اے خرابی تمہاری اللہ کا
ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ	دیا ثواب بہتر ہے ان کے واسطے جو یقین
صَالِحًا وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ	لائے اور کام کیا بھلا اور یہ بات ان ہی
(قصص - ۷۹، ۸۰)	کے دل میں پڑتی ہے جو صبر سے رہنے والے ہیں،

حیاتِ دنیا پر لہو و لعب کا اطلاق قرآن کریم میں متعدد جگہ کیا گیا ہے اور جو لوگ اس کو حیاتِ آخرت پر مقدم سمجھتے ہیں ان کی زجر و توبیخ بے شمار مقامات پر کی گئی ہے، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا بازیچۂ اطفال ہے اور آخرت ہر خیر اندیش کا سرمایہ:

وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا	یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے
لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ	اور پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندہ رہنا
لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ! (عنکبوت - ۶۴)	اگر ان کو سمجھ ہوتی،
إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ	یہ دنیا کا جینا تو کھیل ہے اور تماشا اور اگر تم یقین
وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ	لاؤ گے اور بچکر چلو گے، دیگا تم کو تمہارا بدلا
بدنیا توانی کہ عقبیٰ خری	بخر جانِ من ورنہ حسرت بری

قرآن حکیم نے زندگی دنیا کی ایک مثال دی ہے اور اس کی ماہیت اس طرح بیان کی ہے کہ یہ زندگی لہو و لعب ہے، زینت و تفاخر و تکاثر مال و اولاد میں ہے، یعنی آدمی اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں کھیل کود میں مصروف ہوتا ہے، پھر تماشے، پھر بناؤ سنگار اور فیشن پرستی

میں گرفتار رہتا ہے، پھر نام و نمود کے حصول میں لگ جاتا ہے، پھر جب موت کے دن قریب آتے ہیں تو مال واولاد کی فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ میرے بعد میرا گھر بنا رہے اور اولاد آسودگی سے زندگی بسر کرے، مگر یہ سب ساز وسامان، یہ سارا ٹھاٹھ باٹھ فانی اور زوال پذیر ہے، جیسے کھیتی کی رونق و بہار جو چند روزہ ہوتی ہے، پھر زرد پڑ جاتی ہے اور آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں، اسی شادابی اور خوبصورتی کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا؛ یہی حال دنیا کی زندگی اور اس کے ساز وسامان، زیب وزینت کا ہے، درحقیقت وہ ایک دغا کی پونجی اور دھوکے کی ٹٹی ہے، آدمی اس کی عارضی بہار سے فریب کھا کر اپنا انجام تباہ کر لیتا ہے! موت کے بعد یہ چیزیں کچھ کام نہیں آتیں، وہاں کچھ اور ہی کام آتا ہے، وہ ایمان اور عمل صالح ہے، جو شخص دنیا سے یہ کما کر لے گیا، اس کو اپنے مالک کی خوشنودی اور رضامندی حاصل ہوئی اور جو دولت ایمان اور سرمایہ عمل صالح سے تہی دست گیا، کفر وعصیان کا بوجھ لے کر پہنچا اس کے لیے سخت عذاب، اور جس نے ایمان کے باوجود اعمال میں کوتاہی کی اس کے لیے عذاب کے بعد رہائی و معافی ہے! دنیا کا خلاصہ وہ تھا اور آخرت کا یہ ہوا:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا	جان رکھو کہ دنیا کی زندگانی یہی ہے کھیل
لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ	اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں
بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَ	اور بہتات ڈھونڈھنی مال کی اور اولاد کی
الْاَوْلَادِ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ	جیسے حالت ایک مینہ کی جو خوش لگا کسانوں
نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰہُ مُصْفَرًّا	کو اس کا سبزہ پھر زور پر آتا ہے پھر تو دیکھے
ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا وَفِی الْاٰخِرَۃِ	زرد ہو گیا پھر ہو جاتا ہے روندا ہوا گھاس
عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّمَغْفِرَۃٌ	اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے

مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَیٰوۃُ	اللہ سے اور رضامندی اور دنیا کی زندگانی
الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (حدید - ۲۰)	تو یہی ہے مال دغا کا۔

قرآن حکیم ایک جگہ انسان کی شکایت کرتا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو اور یہاں کے عیش وآرام کو اعتقاداً یا عملاً آخرت پر ترجیح دیتا ہے، حالانکہ دنیا حقیر ونا پائدار اور آخرت اس سے کہیں بہتر و پائدار ہے:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا	کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو دنیا کے جینے کو اور
وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی اِنَّ ھٰذَا	پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا، یہ لکھا ہوا
لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ	ہے پہلے ورقوں میں، صحیفوں میں ابراہیم کے
اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی (اعلیٰ)	اور موسیٰ کے۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات بھی صراحۃً معلوم ہوتی ہے کہ خیر وبقائے آخرت حضرت ابراہیم وموسیٰ علیہما السلام کے زمانہ سے اس زمانہ تک ماثورہ ہے، اور کسی امت کے لیے کسی زمانہ میں بھی ایثار دنیا بر آخرت کا دستور نہیں رہا ہے، گویا اس گھر کی نیستی و ویرانی اور اس گھر کی ہستی وآبادی کا یقین تمام انبیاء علیہم السلام اور ساری کتب سماویہ وآیات الٰہیہ کا قرناً بعد قرن وعصراً بعد عصر متفق علیہ عقیدہ رہا ہے،

جس طرح قرآن کریم کی آیتیں فنائے دنیا وبقائے آخرت کی منادی ہیں اور بآواز بلند کہہ رہی ہیں کہ جب تک کہ دنیا اور زخارف دنیا یا اس کی زینتوں اور لذتوں کی محبت سے قلب پاک وصاف نہیں ہوتا، سلوک الی اللہ میں ایک قدم بھی آگے اٹھ نہیں سکتا۔

ببار اشک چو مشتاق گرد رانبشاں	کہ روے ماہ نہ بینم تا دریں گردیم

اسی طرح احادیث صحیحہ بھی اسی مدعا کی نشاندہی کرتی ہیں، ان میں بعض کا ذکر تدبر وتفکر

کے لیے یہاں کیا جارہا ہے:

مخبر صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

واللہ ما الدنیا فی الآخرۃ الا
مثل ما یجعل احدکم اصبعہ
فی الیم فلینظر بم ترجع
(رواہ مسلم عن المستورد بن شداد)

خدا کی قسم دنیا آخرت کے مقابلہ میں اتنی
بھی تو نہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی
انگلی دریا میں ڈالے پھر دیکھے کہ اس کو
کیا ملا۔

مطلب یہ ہے کہ آخرت گویا دریا کے برابر ہے اور دنیا اس کے مقابلہ میں ایک قطرۂ آب کے مانند!

دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا

ان ھذا المال خضرۃ حلوۃ
فمن اخذہ بحقہ ووضعہ فی حقہ
فنعم المعونۃ ھو، ومن اخذہ
بغیر حقہ کان کالذی یاکل ولا
یشبع ویکون شہیدا علیہ
یوم القیامۃ (متفق علیہ من حدیث
ابی سعید الخدری)

یہ مال ہرا بھرا میٹھا ہے جس نے اس کو لیا
حق پر اور خرچ کیا حق پر تو وہ اس کیلئے اچھا
مددگار ثابت ہوتا ہے اور جو اس کو بغیر حق
لیتا ہے تو اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے
کوئی کھاتا تو ہے لیکن شکم سیر نہیں ہوتا اور یہ
مال قیامت کے دن اس کے خلاف گواہی
دے گا۔

حکیم بن حزام سے یہ حدیث اس طرح روایت کی گئی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، آپ نے مجھے دیا، میں نے پھر سوال کیا، آپ نے پھر دیا، میں نے پھر مانگا، آپ نے پھر دیا اور فرمایا "اے حکیم یہ مال ہرا بھرا میٹھا ہے (یعنی دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے) جس نے اس کو سخاوت نفس کے ساتھ لیا (یعنی بے پروائی و بے طمعی سے لیا)

اس کو برکت دیجاتی ہے اور جس نے اس کو اشراف نفس کے ساتھ لیا (یعنی حرص و طمع سے لیا) اس کو برکت نہیں دیجاتی اور وہ اس شخص کے مانند ہوتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا، دست بالا بہتر ہے دست زیریں سے"۔ حکیم نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا ہے میں اب کسی سے آپ کے بعد کچھ نہ لوں گا، یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو جاؤں، چنانچہ وہ اس عہد پر قائم رہے اور کسی سے کچھ نہ لیا یہاں تک کہ وفات پائی (متفق علیہ) سچ کہا ہے کسی نے

بے نیازی ہمتے دارد کریماں واقف اند
ما ہم از دست رد خود چیز ہا بخشیدہ ایم

حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ

الدنیا دار من لا دار لہ و
مال من لا مال لہ ولہا یجمع
من لا عقل لہ (رواہ احمد
والبیہقی فی شعب الایمان)

دنیا گھر اس کا ہے جس کے کوئی گھر نہیں
اور مال اس کا ہے جس کے کوئی مال نہیں
اور اس کے لیے وہی جمع کرتا ہے جس کو
عقل نہیں!

حدیث طویل عمرو بن عوف میں فرمایا،

فواللہ ما الفقر اخشی علیکم
ولکنی اخشی ان تبسط الدنیا
علیکم کما بسطت علی من کان
قبلکم فتنافسوھا کما تنافسوھا
فتھلککم کما اھلکتھم
(متفق علیہ)

خدا کی قسم مجھے تمھاری مفلسی کا خوف نہیں ہے
بلکہ مجھے خوف یہ ہے کہ تم پر دنیا کشادہ ہو جائیگی
جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی اور
تم اس کے حاصل کرنے میں آپس میں مقابلہ
کرنے لگو گے، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے
کیا تھا اور وہ تمہیں ہلاک کر دیگی جیسا کہ

اسی مفہوم کی دوسری حدیث ہے جس کے راوی ابو سعید الخدریؓ ہیں:

ان مما اخاف علیکم بعدی	مجھے سب سے زیادہ جس چیز کا تمھارے ڈر ہے
ما یفتح علیکم من زھرۃ الدنیا	وہ دنیا کی تازگی اور زینت و زیبائش کی
وزینتھا (متفق علیہ)	کشایش ہے،

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ مخبر صادقؐ کا یہ خوف صحیح نکلا، خلافت راشدہ کے بعد جب اسلام کے فتوحات زیادہ ہوئے تو مسلمان گلزار دنیا کی رونق و بہار کے گرفتار ہو گئے اور بہت کم اس ابتلاء سے محفوظ رہے،

بادہ نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است | گر بدولت رسی مست نگردی مردی

ابو سعید خدریؓ کی دوسری روایت یہ ہے:

ان الدنیا حلوۃ خضرۃ وان	دنیا شیریں و سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ
اللہ مستخلفکم فیھا فینظر کیف	تم کو اس میں خلیفہ بنائے گا پھر دیکھے گا کہ
تعملون، فاتقوا الدنیا واتقوا	تم کیا کرتے ہو، سو بچو تم دنیا سے اور بچو
النساء (رواہ مسلم)	تم عورتوں سے

کیا خوب کہا ہے بہاء الدین عاملی نے

ہر تازہ گلے کہ زیب این گلزار است | گر بہنی گل و گر بچینی خار است
از دور نظارہ کن مرو پیش شمع | ہر چند کہ نور می نماید نار است

دنیا کے متعلق کسی جگہ ارشاد ہوا ہے:

ھذہ الدنیا مرتحلۃ ذاھبۃ	یہ دنیا ایک منزل ہے گزرنے والی اور
وھذہ الآخرۃ مرتحلۃ قادمۃ	یہ آخرت ایک منزل ہے آنے والی۔

ولکل واحد منھما بنون	اور ان میں سے ہر ایک کے فرزند ہیں اگر
فان استطعتم ان لا تکونوا	تم سے ہو سکے تو فرزندانِ دنیا نہ ہو،
من بنی الدنیا فافعلوا فانکم	عمل کرو کہ تم اس وقت دار العمل میں ہو
فی دار العمل ولا حساب وانتم	اور یہاں حساب نہیں اور کل تم
غدا فی دار الآخرۃ ولا عمل	دار آخرت میں ہو گے، اور وہاں
(رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن جابر مرفوعاً)	عمل نہیں!

یہ حدیث بخاری نے بھی حضرت علیؓ سے روایت کی ہے، وہاں بجائے ذاھبۃ وقادمۃ کے مدبرۃ ومقبلۃ کے الفاظ آئے ہیں، جن کا مفہوم ایک ہی ہے،

دنیا کے متعلق یہ بھی فرمایا:

الا ان الدنیا ملعونۃ وملعون	جان لو کہ دنیا ملعون ہے اور دنیا میں
ما فیھا الا ذکر اللہ وما والاہ	جو کچھ ہے وہ بھی ملعون ہے، مگر اللہ کی
وعالم ومتعلم	یاد اور جو اس کے مثل ہے یا عالم یا علم
(رواہ الترمذی وابن ماجہ عن ابی ہریرہ)	سیکھنے والا۔

اس حدیث کے سمجھنے میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کی یاد اور اس کے مثل میں تمام نیک کام داخل ہو جاتے ہیں، اور صرف دنیائے مذموم ہی ملعون قرار پاتی ہے جو انسان کو اپنی محبت میں فریفتہ کرکے جمیل مطلق کی محبت سے باز رکھتی اور ارتکاب محارم پر جری کرتی ہے۔

(باقی)

ملکۂ نور جہاں کے سلسلۂ مادری و پدری کے اہم افراد

از

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

خواجہ شریف ہجری کے دونوں لڑکوں کا ذکر ہفت اقلیم[1] میں ملتا ہے، ایک خواجہ محمد طاہر وصلی، دوسرا خواجہ غیاث الدین محمد، آخر الذکر نور جہاں کا جلیل القدر باپ ہے، جو اعتماد الدولہ کے خطاب سے عہد جہانگیری میں ممتاز ترین شخصیت کا مالک تھا، خواجہ محمد طاہر شاعر تھا، ان دونوں کا تذکرہ ابھی آتا ہے،

خواجہ شریف بڑے پایہ کا شاعر تھا، چنانچہ ہر تذکرہ میں اس کا ذکر بڑی آب و تاب کے ساتھ ملتا ہے، خلاصۃ الاشعار کا بیان اوپر درج ہو چکا ہے، ہفت اقلیم کا بیان ہے،

"بصفای طبع سلیم و نقای ذہن مستقیم و حسن تدبیر و لطف تقریر بین الہمگنان سر آمد زمان خود بودہ"

اس کا دیوان اسی کی حیات ہی میں مدون ہو چکا تھا، مگر ہفت اقلیم لکھتے وقت مؤلف کے پیش نظر نہ تھا، پھر بھی اس نے ۱۹ متفرق ابیات درج کیے ہیں، خوش قسمتی سے اس کے دیوان کے دو نسخے اب تک موجود ہیں، ایک دیوان ہند (لندن) کے مجموعے[2] میں،

[1] ورق ۳۹۹ | [2] نمبر ۱۴۴۰

دوسرا بانکی پٹنہ[1] کے کتابخانے میں، آخر الذکر نسخہ اول الذکر کی نقل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ دونوں کے مطالب ہر لحاظ سے بالکل یکساں ہیں، پھر دیوان کے اجزاء حسب ذیل ہیں:

۱- ہفت بند: یہ ہفت بند جو حضرت علیؑ کی مدح میں ہیں اور ملا حسن کاشی کے ہفت بند کے جواب کے طور پر لکھے گئے ہیں، ان کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے: ورق ۱ ب

السلام ای پرتو مہرت چراغ راہ دیں　　آفتاب مطلع ایمان امیر المومنین

۲- قصائد جن میں بعض شاہ طہماسپ کی مدح میں ہیں، ابتدا اس طرح ہے: ورق ۴ ب

میرسد موکب نوروز بصد جاہ و جلال　　میرود سوی چمن مژدہ رساں پیک شمال

۳- ترکیب بند مسدس ورق ۱۱ ب

ای شوخ جفا پیشہ جفا چند تواں کرد　　آزار من بی سروپا چند تواں کرد

خوں در دجگر اہل وفا چند تواں کرد　　قصد دل آزردہ ما چند تواں کرد

جور و ستم ای عشوہ نما چند تواں کرد　　اینہا باسیران بلا چند تواں کرد

تا چند جفا بر سر بیداد تواں بود

تا چند بغمہای کی ماشاد تواں بود

۴- غزل (بترتیب حروف تہجی ورق ۱۸ ب) اس طرح شروع ہوتی ہے،

ای درفشاں بشکر عطایت زبان ما　　درجیست پر ز گوہر شکرت دہان ما

۵- رباعیات ورق ۵۶ ب۔ بانکی پور کے نسخہ میں ان کی تعداد ۲۷ ہے، پہلی رباعی دونوں نسخوں میں یہی ہے،

زاہد کہ نماز و روزہ اش عادت و خوست　　میخوارہ کہ دستگیر او جام و سبوست

آں کردہ مدام تکیہ بر طاعت خویش　　ایں منتظر رحمت از جانب دوست

[1] ج نمبر ۴۴۲

"دیوان ہند" کا نسخہ ۱۰۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا کاتب عبد الرقیب ہے، بانکی پور کے نسخہ میں تاریخ کتابت درج نہیں، اول الذکر میں ۶۰ ورق اور آخر الذکر میں ۵۹ ورق ہیں۔

ہجری کے دیوان میں اگرچہ زیادہ اصناف سخن موجود ہیں لیکن غزلوں کا حصہ زیادہ ہے، خلاصۃ الاشعار میں فن غزل میں بڑی کوشش کرتا ہے، اس تذکرہ کے قدیم نسخہ[1] میں صرف اسقدر تھا:

"در وادی شعر (غزل) تتبع مردم خراسان میکند"

لیکن بعد والے نسخے[2] میں اتنی عبارت زیادہ ہے:

"در فن غزل کوشش بسیار کردہ و دیوانی ترتیب دادہ اما ہیچ ازاں شہرت نیافتہ"

"مردم خراسان" کے تتبع کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ اس کی شاعری کا نشوونما خراسان اور ہرات میں ہوا تھا جہاں اس کے تقریباً ۲۰ سال صرف ہوئے جو اس کی عمر کے ۳۸ سال سے ۵۸ سال تک ہوتے ہیں، یہی زمانہ زندگی کا بہترین زمانہ ہوتا ہے، اس لیے اس کی شاعری مشرقی ایران سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہوگی، ذیل میں چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

اسیر لذت شیرینی گفتار او گردم — ہلاک چاشنی لعل شکر بار او گردم

سر زلفش بہر تاری چو من سرگشتہ دارد — جز زلفت آنکہ برگرد سر ہر تار او گردم

نہ درہ از پی رخشش غبار بر خیزد — فتادہ ای چو من از رہگذار بر خیزد

در امید نبستی چنانکہ در ہمہ عمر — کسی چو پیش تو امیدوار بر خیزد

آتش خرمن من سوختہ خرمن داند — ہجر من سوختہ، سوز دل من داند

بنعماں پای بدامان فراغت دارند — پای عشاق کجا لذت دامن داند

دشمن و دوست بفریاد وفغا نند ہمہ — زاں جفا پیشہ کہ نہ دوست و نہ دشمن داند

[1] ورق ۲۵۹/۲۶۴ [2] ورق ۱۳۱، ۲

ہجری از دوی تو دوی تو میاید فیض — باغباں قدر گل و لذت گلشن داند

اگرچہ ان چند اشعار سے اس کی شاعری پر بحث تو نہیں کی جا سکتی مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ خوش فکر شاعر ضرور ہے، گو بڑے عمیق و دقیق خیالات کی تلاش اس کے یہاں بے سود ہوگی۔

خواجہ غیاث الدین محمد:- خواجہ عام طور پر مرزا غیاث بیگ کے نام سے مشہور ہے، یہی وہ خوش نصیب ہے جس کو نور جہاں کے باپ ہونے کا فخر حاصل ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ شریف کے مرتے ہی اس خاندان پر ادبار آگیا، ایران میں خواجہ کے ہونہار لڑکے کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آیا، اس لیے مرزا غیاث کو والد کے مرتے ہی ۹۸۴ھ کے بعد عازم ہندوستان[1] ہونا پڑا، اس کے ساتھ اس کی بیوی اور دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی، ہندوستان میں اس وقت مرزا غیاث کا حقیقی سالا غیاث الدین علی[2] آصف خاں کے لقب سے ملقب اکبری دربار میں ایک ممتاز عہدے پر فائز تھا، بظاہر مرزا غیاث کو ہندوستان آنے میں اس کی موجودگی سے تقویت ملی ہوگی، ورنہ خود اس کے دو سالے طہماسپ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے، بدیع الزماں[3] کاشان کا وزیر تھا، اور مرزا احمد خراسان کا، اس کا تیسرا سالا آقا محمد زماں تبریز میں کسی بڑے عہدہ پر متمکن تھا، خود اس کا حقیقی خسر آقا ملا دواتدار بڑی باثر شخصیت کا مالک رہ چکا تھا، بہر حال ان وجوہ کے باوجود شاہ طہماسپ کے مرتے ہی وہ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، قندھار پہنچا تو نور جہاں پیدا ہوئی، اس سلسلے کے سارے واقعات بہت عام ہیں جن کا دہرانا غیر ضروری ہے۔

مرزا غیاث بہت جلد دربار اکبری میں باریاب ہو گئے اور چند ہی دنوں میں اپنے حسن خدمات

[1] ماثر الامراء ۱، ص ۱۲۸ [2] ایضاً ص ۹۰ [3] ایضاً و نیز عالم آرای عباسی (تہران اڈیشن، امیر کبیر) ج ۱ ص ۱۶۶ - ان کے متعلق تفصیلات بعد میں آئیں گی۔

کی بنا پر "سہ صدی" منصب پر فائز ہوئے۔ اکبری عہد کے چالیسویں سال کابل کی دیوانی کے لیے نامزد ہو گئے۔ اس کے بعد ہزاری منصب اور دیوانی بیوتات سے مشرف ہو کر بڑی ناموری حاصل کی، جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی اعتماد الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور مرزا جان بیگ وزیر الممالک کے ساتھ دیوانی سرکار والا میں شریک ہوئے، مگر پھر چند دنوں اپنے لڑکے محمد شریف کی غلط کاریوں کی وجہ سے معتوب رہے، لیکن ۱۰۲۰ھ میں جب مہر النسا، نور محل اور نور جہاں ہو کر شاہی حرم کی زینت بنی تو اعتماد الدولہ وکیل کل مقرر اور شش ہزاری منصب اور تین ہزار سوار، علم، نقارہ سے مشرف و سرفراز ہوئے، اور روز افزوں ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ ۱۰۳۱ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، اور اپنے اہم فرزندوں اور عزیزوں کو داغ مفارقت دیا۔[1]

امین احمد رازی کے محتاط قلم نے اپنے چچا کے حقیقی خد و خال کو کس خوبی سے اجاگر کیا ہے:[2]

اگرچہ گاہ گاہ از بحر اندیشہ در آبدار بہ ذکر کنار میاورند اما ہرگز تاج تقریری و اکلیل تحریری را از ان مکلل و مرصع نساختہ اند۔ اما چند ال جواہر نثر بر صحایف روزگار و جراید لیل و نہار بیادگذاشتہ کہ دامن و کنار راتواں پرساخت و ایضاً خطی (دارد) در نہایت لطافت طبعی در کمال نظافت و در تتبع سخنان اکابر بسیار کامل است و در خواندن و داشتن دواوین بغایت مولع و مایل ... و با این نسبت سالہاست تا صاحب رتق و فتق معاملات این سرکار کان لیاقت و براسی ذہن و اندیشہ دوربیں زمام مصالح خاص و عام را در کف کفایت خود در آوردہ و مہر فتق و مواسا بیوتات را با مضا میر ساند ..."

تذکرہ ہفت اقلیم ۱۰۰۲ھ میں یعنی اکبری عہد کے ۳۹ ویں سال لکھا گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کابل کی دیوانی یا تو اس سے پہلے مل چکی تھی یا اس دیوانی سے قبل ہی وہ دیوانی بیوتات کے عہد

---

[1] یہ تفصیلات مآثر الامراء ج ۱، ص ۱۲۷، ۱۲۰ سے ماخوذ ہیں [2] ہفت اقلیم ورق ۳۹۹ ب۔ ۴۰۰ الف

جلیلہ پر فائز ہو چکا تھا، کیونکہ ہفت اقلیم[1] کے آگے کے اور بیانات سے مرزا غیاث بیگ کے ناظم امور دیوانی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

خواجہ محمد طاہر وصلی[2]: یہ خواجہ محمد شریف ہجری کا دوسرا نامور فرزند تھا، اور باپ کی طرح یہ بھی اچھا خاصہ شاعر تھا، وصلی تخلص کرتا تھا۔ اس کے ساتھ علم سیاق، وسعت مشرب و بی تکلفی" میں بھی بہرہ کامل رکھتا تھا۔ اور یہ ساری خوبیاں اس کے منشآت میں پائی جاتی ہیں، امین احمد کے الفاظ میں "منشآتش عروسانند کہ بی غالیہ زینت پارہ و بی تکلف غازہ استعارہ عشرت بخش خاطرہا و مسرت [اندوز دلہا] توانند بود۔"

وصلی کے سلسلۂ حیات کی کڑیاں نہیں ملتیں، صرف تقی اوحدی[3] نے کچھ تفصیل بہم پہنچائی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے بھائی مرزا غیاث کے نقش قدم پر چل کر عازم ہندوستان ہو چکا تھا، اس کے ساتھ اس کا لڑکا محمد صادق بھی تھا، دونوں کو تقی اوحدی نے لاہور میں دیکھا تھا، عرفات عاشقین[4] کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقی مذکور ۱۰۱۶ھ کے قریب لاہور پہنچا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ ایران سے ہندوستان جا رہا تھا، لاہور میں اس کا قیام تقریباً ڈیڑھ سال رہا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان ہی دنوں میں وصلی سے ملاقات ہوئی ہوگی، ان ایام میں جہانگیر کا قیام لاہور ہی کے اطراف میں تھا، وہ خسرو کے تعاقب میں ۹ محرم ۱۰۱۵ھ کو لاہور پہنچا اور ۲۶ ذی الحجہ ۱۰۱۵ھ تک وہیں رہا، پھر کابل روانہ ہوا اور ۱۴ صفر ۱۰۱۶ھ کو کابل پہنچا، ۱۴ جمادی الاول ۱۰۱۶ھ کو وہاں سے واپس ہو کر ۱۳ شعبان سنہ مذکور

---

[1] ہفت اقلیم ورق ۳۹۹ ب۔ ۴۰۰ الف [2] ہفت اقلیم ورق ۴۰۰ الف۔ اسکے حالات سفینۂ خوشگو، ریاض الشعراء، صحف ابراہیم اور مخزن الغرائب میں بھی ملتے ہیں [3] ملاحظہ ہو فہرست بانکی پور ج ۲ ص ۱۲۲ [4] ملاحظہ ہو مقدمہ عرفات د میرا مضمون بعنوان "عہد جہانگیر کا ایک اہم مصنف و شاعر" معارف نمبر ۱ جلد ۷۰، ص ۳۲ - ۳۶

میں لاہور آگیا، پورا رمضان گذارنے کے بعد آگرہ روانہ ہوا، ممکن ہے کہ خواجہ وصلی دربار جہانگیری میں باریاب رہا ہو، یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ایران سے آتے وقت وہاں ٹھہر گیا ہو، ان دنوں[1] اس کا بھائی اعتماد الدولہ شاہی نظر عاطفت سے محروم تھا، کیونکہ اس کا لڑکا محمد شریف[1] خسرو کی بغاوت میں شریک ہو گیا تھا۔

تقی اوحدی نے عرفات میں دوبارہ لکھا ہے[2] کہ ۱۰۰۴ھ میں اس نے دونوں کو پھر آگرہ میں دیکھا، مگر یہ تاریخ غلط درج ہوگئی ہے، دراصل تقی نے ۱۰۲۴ھ میں دیکھا ہوگا، کیونکہ ان ہی ایام میں وہ آگرہ میں مقیم تھا، اور اپنے شہرۂ آفاق تذکرۂ عرفات کی تدوین میں مصروف تھا، اس لیے وصلی اور اس کے لڑکے کی ملاقات کی تاریخ ۱۰۲۴ھ ہی ہوگی،

وصلی کی شاعری کے بارے میں اس کے چچازاد بھائی امین احمد نے جو کچھ لکھا ہے[3] اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کے اشعار میں واقعاتی پہلو کا فقدان ہو، لیکن سلاست و متانت انکا خاص جوہر ہے، "طفلانِ وار داتش اگرچہ در دبستان وقوع چندانی تعلیم ندیدہ اند اما در سلاست و متانت نہایت لطافت را دارند"۔

اس کا دیوان مدون ہو چکا تھا اور خوش قسمتی سے اس کے دو نسخوں کا پتہ چل گیا ہے، ایک دیوان ہند (لندن)[4] میں ہے اور دوسرا بانکی پور[5] میں، دیوان ہند کے نسخے کا کاتب وہی ہے جس نے اس کے باپ ہجری کے دیوان کو لکھا تھا، یعنی عبد الرقیب اور سنہ کتابت دونوں کا ایک ہی یعنی ۱۰۶۹ھ ہے، اس لیے اس نسخے کی اہمیت دوہری ہے۔ ایک

---

[1] ماثر الامراء ج ۱ ص ۱۲۹ [2] ملاحظہ ہو فہرست بانکی پور ج ۲ ص ۱۷۲ اور ج ۳ ص ۳۰-۳۱ [3] ملاحظہ ہو ہفت اقلیم ورق ۴۰۰ ب [4] فہرست مخطوطات فارسی ص ۸۱۵-۸۱۶ نمبر ۱۴۹۳ [5] فہرست بانکی پور ج ۳ ص ۳۰-۳۱ نمبر ۲۸۳ [6] یہ ناقص نسخہ کا ہے جیسا کہ فہرست دیوان ہند سے پوری طرح ظاہر ہے۔

قدامت کی بنا پر، دوسرے باپ اور بیٹے کے دیوان کی ایک ہی موقع پر لکھے جانے کی بنا پر۔

دوسرا نسخہ بانکی پور کا ہے، جس کے اجزاء اگرچہ دیوان ہند کے مشابہ ہیں لیکن آخری جزو کم ہے،

دیوان ہند کا نسخہ ان اجزاء پر مشتمل ہے:-

۱- غزلیات، رباعیات، فرد بترتیب حروف تہجی (ورق ۷۶ ب) ابتدا

خوش وقت و خنداں بگذراں خوشوقت و خندان صبح را

شاید کہ تا صبح دگر دریافت نتوان صبح را

۲- ترجیعات و رباعیات (ورق ۸۲ ب) ابتدا:

چہ کردہ ام کہ دگر مُہر بر دہاں داری خدنگِ ناز دگربارہ در کماں داری

۳- مثنوی در صفت گنجفہ (ورق ۹۱ ب) ابتدا:

زبردستِ وزیر خواہد باج چوں گدائی بچرخ خود محتاج

۴- قصاید، قطعات، رباعیات، فرد (ورق ۹۵ آ) ابتدا:

نزدیک شد دلا کہ سر آید زمانِ غم مدہد بزورگار دگرکس نشانِ غم

۵- مثنوی خسرو و شیریں (ورق ۱۰۱ ب) ابتدا:

الٰہی شیوۂ طاعت عطا کن بنورِ خود دلم را آشنا کن

یہ مثنوی ناتمام ہے[1]، بانکی پور کے نسخے کا بھی یہی حال ہے، لیکن یہاں پر نسخے کا نقص پوری طرح نمایاں ہے،

۶- قصائد، ترجیعات، قطعات، غزلیات، رباعیات (ورق ۹-۱۰ آ) اس حصے کے ابتدائی ابیات نہیں پائے جاتے، گویا جزو پنجم کا آخری حصہ اور جزو ششم کا ابتدائی حصہ

---

[1] یہ نقص نسخہ کا ہے، جیسا فہرست دیوان ہند سے پوری طرح ظاہر ہے،

غائب ہو چکا ہے، بانکی پور کے نسخے سے یہ حصہ خارج ہے، اور جزو پنجم تک ختم ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ جزو بھی وہاں نمایاں ہے، اس سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ بانکی پور والا نسخہ غالباً اسی نسخہ کی نقل ہے، بانکی پور کے نسخے میں کسی نے دوسرے قلم سے "تمام شد" کا فقرہ شامل کر دیا ہے۔

ہفت اقلیم میں وصلی کے حسب ذیل ابیات درج ہیں:

سرگرانست بمن یار نمیدانم چیست   مہربانست باغیار نمیدانم چیست
سبب خواری من درنظرش معلوم است   موجب عزت] اغیار نمیدانم چیست
باعثی بود کہ ہر بار زمن میرنجید   سبب رنجش این بار نمیدانم چیست

چند از عشق دلا بی سروسامان باشیم   بہ کہ یکچند ازین کردہ پشیمان باشیم
ہجر و وصل است کزان شاد و غمین است عاشق   ما چہ در ہجر چہ در وصل پریشان باشیم
گر بوصلیم جگر خستۂ خار رشکیم   در بہجریم دل آزردۂ ہجران باشیم
وصل آمیختہ بار شک [گر] از ہجران نیست   وصلی از وصل چنین بہ کہ گریزان باشیم

یہ اشعار ۱۰۰۲ھ سے قبل کے ہیں، کیونکہ تذکرۂ مذکور اسی سنہ میں مرتب ہوا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر ہندوستان آنے کے قبل وصلی کی شاعری مقبول ہو چکی تھی، وصلی کا تخلص بھی قابل توجہ ہے، یاد رہے کہ اس کا باپ خواجہ شریف ہجری تخلص کرتا تھا۔

اعتماد الدولہ کے فرزندوں کے تذکرہ کا زیادہ موقع نہیں، اس لیے کہ اولاً ہندوستان کی تاریخ میں وہ سب بڑے اہم ہیں، ثانیاً ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، خود اس کے چار لڑکوں میں تین نوازشات شاہی سے شرف یاب تھے، ابوالحسن مرزا[1] نور جہاں کا بڑا بھائی تھا،

[1] اس کا حال مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۵۰ تا ۱۶۰ تک مندرج ہے، ۱۰۵۱ھ میں وفات پائی اور جہانگیر کے مقبرہ کے قریب لاہور میں مدفون ہوا۔

جو اعتقاد خانی، خان سامانی اور آخر میں آصف خانی[1] خطابات سے سرفراز ہو چکا تھا، اس کی شادی اس کے ماموں مرزا غیاث الدین آصف خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی، ابوالحسن کی صبیہ ارجمند بانو شاہزادہ خرم سے منسوب تھی، جو بعد میں ممتاز محل ہوئی، اور جس کی یادگار تاج محل ہے، آخر میں نور جہاں اور مرزا میں اختلاف ہو گیا تھا، جو تاریخ ہند میں مشہور و عام ہے، دوسرا لڑکا ابراہیم خاں[2] فتح جنگ کے خطاب سے ممتاز تھا، تیسرا لڑکا مرزا شاپور، اعتقاد خانی[3] خطاب یافتہ تھا، البتہ محمد شریف خسرو خاں کی بغاوت میں شریک ہونے کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا، لڑکیوں میں نور جہاں تھی، جس کے کردار کی بلندی ان سطور کی تحریر کی محرک ہوئی ہے، ایک اور لڑکی خدیجہ بیگم[4] حاکم بیگ[5] سے منسوب تھی، خدیجہ بیگم کی ایک لڑکی باقر نجم ثانی سے منسوب تھی، باقر کی حیثیت بڑی اہم ہے، اس لیے اس کے متعلق چند سطریں درج کیجاتی ہیں:

باقر خاں یہ نجم ثانی کے خاندان کا ایک فرد تھا، نجم ثانی جب ۹۱۸ھ میں ازبکوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو اس خاندان پر تباہی آگئی، باقر خاں کا باپ ایک مدت تک خراسان کا دیوان تھا، جب اس کی بھی حالت تباہ ہوئی تو باقر بے سروسامانی کے عالم میں عازم ہندوستان ہوا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اکبری عہد میں یہاں پہنچا تھا اور ابتداءً سہ صدی منصب دار ہوا تھا، مگر بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جہانگیر کے دربار میں اول اول آیا اور دو سو کا منصب دار مقرر ہوا، خان جہاں لودی کی سفارش سے "نہ صدی سی سوار" کے منصب پر فائز ہوا، اس کے بعد جب نور جہاں کی بھانجی خدیجہ بیگم سے عقد ہوا تو منصب میں اضافہ ہوا، دو ہزاری منصب دار اور ملتان کا حاکم ہوا، جہانگیر انتہائے شوق میں اسے

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۵۳ تا ۱۳۵ [2] ملاحظہ ہو مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۸۰-۱۸۲

[3] ایضاً ص ۴۰۱-۴۰۵ [4] حالات ملاحظہ ہوں ایضاً ص ۵۷۳-۵۷۶ [5] ملاحظہ ہو ایضاً ۲۰۴-۲۱۲

فرزند کہتا تھا، شاہزادہ شاہجہاں کے ہنگامے میں اودھ کا صوبیدار تھا، شاہجہاں نے پھر اسے اڑیسہ کا صوبیدار مقرر کر دیا، اس کا باپ بھی اس کے ہمراہ تھا، چنانچہ اڑیسہ میں وہ راہی عدم ہوا، شاہجہانی دور کے پانچویں سال اڑیسہ سے معزول ہوا، اور چھٹے سال گجرات کا صوبیدار بنایا گیا۔ اس کے بعد الہ آباد کا ناظم ہوا، اور دسویں سال یعنی ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں طبعی موت سے مر گیا،

باقر خاں شجاعت و مردانگی میں بے ہمتا تھا، فنون سپہ گری و تیر اندازی میں مشکل سے اس کا ثانی ملے گا، تزک جہانگیری میں اس کی مہارت تیر اندازی کا ایک واقعہ منقول ہے، وہ شاعری میں بھی پوری دسترس رکھتا تھا، بہت اچھا خطاط اور نثار بھی تھا، اس کی حیات ہی میں اس کا دیوان مدون ہو چکا تھا، خوش قسمتی سے . . . . لندن[1] کے کتب خانے میں اس دیوان کا نسخہ موجود ہے، جس کے اجزا یہ ہیں:

۱- موعظہ جہانگیری جو ایک طرح کا نیم سیاسی و اخلاقی و اجتماعی رسالہ ہے اور جہانگیر کے نام معنون ہے، یہ ۱۰۲۱ھ میں مرتب ہوا تھا، لفظ "موعظہ" سے تاریخ نکلتی ہے، یہ ایک مقدمہ اور دو ابواب پر مشتمل ہے، باب اول میں ۹ فصلیں اور باب دوم میں ۱۴ فصلیں ہیں۔

[ورق ۲۷۶ ب - ۳۱۳ ا] ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"سپاس و ستایش مرحکیمے را کہ بحکمت بالغہ وصفت کاملہ" الخ

۲- دیوان کے حسب ذیل اجزا ہیں

(ا) قصائد (ورق ۳۱۳ ب - ۳۱۹ ا) ابتدا:

آسان ترست پیش من از صحبت ریا — در جنگ شیر بودن و در کام اژدہا

(ب) غزلیات (۳۱۹ ب - ۳۳۴ ب)

۱؎ فہرست مخطوطات فارسی ریو ص ۸۲۸ - ۸۳۰، مخطوطہ نمبر ۱۵۳۵

(ج) قطعات، رباعیات، معمات (ورق ۳۳۵ - ۳۴۱ ا)

(د) ایک قطعہ کی تشریح جو اس کے سفر دہلی میں نظم ہوا تھا، اس کا تعلق ایک خواب سے تھا جس میں اس نے امام ہشتم کو دیکھا تھا، اس حصہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے: [۳۴۱ ب - ۳۴۷ ا]

"حمد ملکی را کہ نظام نظم سلسلہ بدو وجود از آثار جود الخ"

(ح) انشا، یعنی اس کے رقعات وغیرہ کا مجموعہ (۳۴۷ ب - ۳۶۶) ابتدا:

"موزوں ترین کلامی کہ غزل سرایان انجمن مقال و چہرہ پردازان شواہد قصاید الخ"

یہ نسخہ اس کی وفات کے ۱۷ سال بعد لکھے جانے کی بنا پر خاصہ اہم ہے،

باقر خاں کے دو لڑکے تھے، بڑا لڑکا مرزا صابر آغاز جوانی میں مر چکا تھا، دوسرا لڑکا فاخر خاں[1] جو اپنے عہد میں نام آور ہوا ہے،

خواجہ محمد شریف کے سلسلہ کے اجمالی تذکرے کے بعد اب اس کے دونوں بھائیوں یعنی خواجہ مرزا احمد اور خواجہ خواجگی کے سلسلہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خواجہ مرزا احمد = مولف ہفت اقلیم کا باپ اور خواجہ شریف کا بھائی تھا، مولف کے محتاط قلم نے اس کے متعلق بھی کسی قسم کے مبالغے سے کام نہیں لیا ہے، اس کے بیان کا خلاصہ[2] یہ ہے کہ بڑا جری اور با حوصلہ اور باغ لگانے اور قنات (نہر) کھدوانے کا بڑا شائق تھا، اور اپنی وسعت بھر اس کا دسترخوان غربا کے لیے ہمیشہ کشادہ و آمادہ رہتا، میزبانی و مہمان نوازی اس کا محبوب مشغلہ تھا، شاہ طہماسپ صفوی اس پر بڑی شفقت کی نظر رکھتا، اور

۱؎ ملاحظہ ہو مآثر الامراء ج ۳ ص ۲۶ - ۲۸ شاہجہانی دور میں سات سو ذات اور ڈیڑھ سو سوار کا منصبدار تھا، عالمگیر نے مفاخر خاں کا خطاب عطا کر کے ہزاری ذات اور ساڑھے چار سو سوار کا منصب عطا کیا تھا۔

۲؎ ہفت اقلیم ورق ۱۴۰۰ ا، ب

ہمیشہ اپنے عنایات سے سرفراز کرتا رہتا تھا، چنانچہ بادشاہ کہا کرتا:

مرزا احمد طہرانی ما — ثالث خسرو و خاقانی ما
مرزا احمد شاپور آمد — از عقب دشمن او کور آمد

چند سال رے کا کلانتری اور متصدی خالصجات تھا، شاہ طہماسپ کے بعد سلطان محمد[1] کے زمانے میں بھی اس کے اعزاز برقرار رہے، خواجہ مذکور اپنے فرائض منصبی کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتا، اور وفات تک اسی عہدے پر سرفراز رہا، وفات کا سنہ معلوم نہیں لیکن ۹۸۵ھ کے کافی بعد تک بقید حیات تھا،

خواجہ مرزا احمد نے موزوں طبیعت پائی تھی، کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا حسب ذیل رباعی میر اسماعیل مجدی کے گھوڑے سے گرنے اور دو دانت ٹوٹ جانے کے موقع پر کہی تھی،

طی کرد فلک جملۂ عالم یکسر — می جست برای گوش خورشید دُرر
چوں جنس نفیس خواست نامد بکفش — از حقہ یاقوت تو برد ایں دو گہر

امین احمد رازی امین احمد مرزا احمد کا لڑکا اور مرزا غیاث کا چچازاد بھائی تھا، یہ اپنی زندۂ جاوید تالیف ہفت اقلیم کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا، افسوس یہ ہے کہ اس نے اپنا حال کچھ بھی نہیں لکھا، اس لیے ہم کو اس کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں، البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی ہندوستان آیا تھا، اور یہاں کچھ دنوں قیام کیا تھا، اگرچہ اس ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کے اعزہ موجود تھے، مگر اس نے نہ تو کسی کی بیجا مدح کی اور نہ کسی کا ذکر اپنے واسطے سے کیا، جب وہ اپنے کسی عزیز کا حال لکھتا ہے تو کہیں سے اندازہ نہیں ہو سکتا

[1] سلطان محمد خدابندہ ۹۸۴ھ کے بعد تخت نشین ہوا، اور ۹۹۵ھ تک حکمراں رہا، اسی درمیان میں خواجہ احمد کی وفات ہوئی تھی۔

کہ اپنے عزیز کا تذکرہ لکھ رہا ہے، یہ اس کا غیر معمولی کمال تھا جس پر بہت کم مصنف پورے اترتے ہیں، ہزاروں صفحوں کی کتاب میں جو حضرت اصحاب کمال کے تذکرہ پر مشتمل ہو، اپنا نام تک نہ لانا بے غرضی کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی، اس کا محتاط قلم ہمیشہ مبالغہ سے پرہیز کرتا ہے، ان وجوہ سے امین احمد کا مرتبہ بحیثیت ایک مورخ و تذکرہ نگار کے بہت بلند ہے، اور اس کی تصنیف ہر دور میں ایک شاہکار سمجھی جائے گی۔

ہفت اقلیم سات اقلیموں پر مشتمل ہے، ہر اقلیم کے مخصوص شہروں کا پہلے مختصر جغرافیہ دیا ہے، پھر وہاں کے مشاہیر فضلا و شعرا کا تذکرہ معتبر و مستند ذرائع سے لکھا ہے، اس کتاب کی ساتوں اقلیم اس طرح پر ہیں:

اقلیم اول یمن وغیرہ
اقلیم دوم مکہ وغیرہ
اقلیم سوم ایران، عراق، عرب وغیرہ
اقلیم چہارم مروشہجان ٹھٹہ وغیرہ
اقلیم پنجم شروان باکو وغیرہ
اقلیم ششم ترکستان فاراب وغیرہ
اقلیم ہفتم بلغار صقلاب وغیرہ

ہندوستان کے مختلف شہروں اور بادشاہوں کا حال پہلی، دوسری اور تیسری اقلیم میں پایا جاتا ہے، اقلیم دوم میں دکن، احمد نگر، پٹن، دولت آباد، خیبر، جیول، تلنگانا، گولکنڈہ، احمد آباد، کھمبایت و سورت، سومنات، ناگر، بنگالہ (مع ۲۲ توقان کے ادنبر، شریف آباد، مدارن، ساتگام، سلیم آباد، سنارگانو، سری، جنت آباد، مالدہ،

گور، گور کاسہ، باریک آباد) اوڈیسہ، کوچ، شامل ہیں، دکن کے ضمن میں بہمنی بادشاہوں اور احمد نگر کے عادل شاہیوں کے حالات مختصر مگر بہت دلچسپ ہیں، بنگال کے مختلف حصوں کے متعلق بعض قابل توجہ معلومات بہم پہنچائے ہیں،

اقلیم سوم میں لاہور، نگر کوٹ، سرہند، ہانسی، تھانیسری، پانی پت، دہلی، آگرہ، لکھنؤ، اودھ، کالپی، متھرا کا ذکر شامل ہے، ان مقاموں کے مختلف سماجی اور اجتماعی حالات کے ساتھ وہاں کے مشاہیر کا تذکرہ ہے، آخر میں شاہان ہند کا تذکرہ ہے، جو سبکتگین سے شروع ہوکر اکبر بادشاہ پر ختم ہوتا ہے، اس کے بعد اکبری دربار کے چند نامور امرا اور شعرا، کا ذکر ہے، ایک بات قابل توجہ ضرور ہے کہ اس کے یہاں جو شاعر مذکور ہیں ان میں سے کسی کو دوسرے تذکروں میں قابل لحاظ نہیں سمجھا گیا ہے،

اقلیم چہارم میں کشمیر اور وہاں کے حسب ذیل مشاہیر کا حال ہے، یوسف خاں، مولانا میر علی عیرفی، مولانا محمد امین، شیخ یعقوب، مظہری، حمیدی، اوجی، ہری، نامی، یہ تذکرہ ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوا، "تصنیف امین احمد رازی"[1] سے تاریخ نکلتی ہے، صرف اسی فقرے میں مصنف کا نام آیا ہے، اس کے علاوہ پوری کتاب میں کسی دوسری جگہ صراحۃً ذکر نہیں، بظاہر یہ تذکرہ ہندوستان کے قیام کی یادگار ہے۔

اس تذکرے کے پہلے دو اقلیم مکمل اور تیسری اقلیم کا ایک ثلث، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے ۱۹۱۸ء میں تین حصوں میں شائع ہوئے ہیں، پورا تذکرہ ڈاکٹر اقبال آشتیانی اور مشہور محقق محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی توجہ سے تصحیح ہو چکا تھا، اور چھپنے کے لیے تیار تھا، معلوم نہیں چھپا یا نہیں، البتہ اس سلسلے کی تین کتابوں میں ایک یعنی عتبۃ الکتبہ چھپ چکی ہے،

(باقی)

[1] ہفت اقلیم ورق ۲ ب [2] ملاحظہ ہو کتاب علامہ قزوینی (از انتشارات وزارت فرہنگ) ص ۸۵ و مجلۂ یادگار شمارہ دہم از سال پنجم، بقلم عباس اقبال آشتیانی۔

اسلامی فلسفہ اور دینیات کا اثر

یورپی فلسفہ اور دینیات پر

مترجمہ
سید مبارز الدین صاحب رفعت لکچرار گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، گلبرگہ

(۴)

ابن باجہ اور ابن طفیل سے گذر کر ہم اس بیان کو ابن رشد کے ذکر پر ختم کرتے ہیں، جو ان سب میں فلسفہ کا . . . . سب سے بڑا شارح ہے، ابو الولید ابن رشد (۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء — ۵۹۵ھ / ۱۱۹۸ء) مشرق سے زیادہ مغرب اور مغربی فکر سے تعلق رکھتا ہے، اطالیہ میں اس کا اثر سولھویں صدی تک باقی رہا اور یہی اثر اشیلینی اور پمپونازی (Achillini and Pomponzzi) نزاعوں کا باعث ہوا، عصر حاضر کی تجرباتی سائنس کی ابتدا تک "ابن رشدیت" کو یورپی فکر میں ایک زندہ محرک کی حیثیت حاصل رہی، لاطینی زبان نے ابن رشد کی ایک سے زیادہ کتابیں محفوظ رکھی ہیں، حالانکہ عربی میں یہ کتابیں ناپید ہو گئی ہیں، ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ابن رشد کی کتابیں مغرب کے چوٹی کے عالموں کی توجہ اپنی طرف منعطف رکھتی تھیں گو اسلام میں ابن رشد کو کبھی بھی استناد کا درجہ حاصل نہیں ہوا،

ابن رشد کا تعلق قرطبہ کے ایک فقیہ گھرانے سے تھا، اس کا دادا اور باپ اور وہ خود قرطبہ کے قاضی رہے، ابن رشد کو قضاۃ کے فرائض کے دوران میں جب کبھی فرصت

ملتی تو وہ فلسفیانہ تصانیف اور شرحوں کے لکھنے میں مصروف ہو جاتا تھا، کسی زمانے میں اسے مراکشی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا، مگر علماے دینیات کی باضابطہ مخالفت اس کے زوال کا باعث بنی، اس پر زندیقیت بلکہ یہودیت سے مشابہ الحاد کا الزام لگا کر قرطبہ سے نکالدیا گیا مگر مرنے سے پہلے اس نے اپنا کھویا ہوا رسوخ پھر حاصل کرلیا، اور اسے مراکش واپس بلالیا گیا یہیں اس نے ۱۱۹۸ء میں وفات پائی، اس کا مقبرہ اب بھی یہاں موجود ہے،

صدیوں تک ابن رشد اس نظریہ کا نمایندہ مانا جاتا رہا کہ فلسفہ حق ہے اور الہامی مذاہب باطل ہیں، اس کے لیے برابانت کا سیجر (Sigar of Barabant) سب سے زیادہ ذمہ دار ہے، کیونکہ جب کبھی اس نے نصرانی عقائد کے معارض کوئی نظریہ پیش کیا تو اسے ارسطو کی سند بخش دی، اور ابن رشد نے اس فلسفی کے مبہم بیانات کی جو شرح کی تھی اس کا حوالہ دیدیا، سیجر کا خیال تھا کہ دین اور عقل دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، ابن رشد نے جو کچھ لکھا اور سوچا تھا اس کو ٹھیک طور پر نہ سمجھنے اور اس میں تحریف کی وجہ سے کلیسا نے سیجر کے ساتھ اس کے ماخذ کو جہاں سے اس نے اپنے نظریے لیے تھے، مطعون قرار دیا، اس لیے قدرتی طور پر ابن رشد ہی کو "ابن رشدیت" کا بانی سمجھا گیا، اسی طرح زمانہ حال میں نستوریس (Nestorius) کو "نستوریت" کا الزام سہنا پڑا ہے، سینٹ تھامس نے اس نظریہ پر بڑی لعن طعن کی ہے کہ وحدت عقل کا عقیدہ عقلاً ضروری ہے، لیکن مذہباً اسے بالکلیہ رد کر دینا چاہیے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابن رشد کو سینٹ تھامس سچا فلسفی نہیں مانتا تھا ...... پیرس کے بشپ اسٹیفن کے اس مشہور خط نے جو "ابن رشدیت" کے دوسو انیس قابل اعتراض مسائل پر لکھا گیا ہے، ابن رشد پر آزاد خیالی اور زندیقیت کے بانی مبانی ہونے کے الزام پر مہر تصدیق ثبت کر دی[1]، بے شبہہ ابن رشد کی یہ تعلیم کہ تمام

---

[1] اس موقع پر ابن رشد بحیثیت فلسفی اور ابن رشد بحیثیت شارح افلاطون فرق کرنا ضروری ہے، جامعۂ

نفوس میں ایک ہی عقل ہوتی ہے اور اسی کے اجزا منقسم ہو کر مختلف اجسام میں مقیم رہتے ہیں، نصرانیوں اور مسلمانوں کے نزدیک کفر ہے، مارٹن کی کتاب "مذاہب کا خنجر" میں اس مسئلہ پر مفصل بحث موجود ہے، اور اس کے بارے میں مارٹن کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ ایک طرح کا ہذیان اور بکواس ہے[1]۔

اب جبکہ ابن رشد کی مستند تحریروں کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور وہ آپ اپنی نمایندگی کر سکتا ہے، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نصرانی ملکوں میں "ابن رشدیت" کے نام سے جو نام نہاد ذہنی تحریک چلی تھی، ابن رشد اس کا ہرگز ذمہ دار نہیں ہے، اس کے برخلاف ابن رشد اور سینٹ تھامس دونوں عقل و دین کی ہم آہنگی کے ایک ہی نقطۂ نظر کی حمایت میں شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نصرانی عالم سینٹ تھامس نے بہت سی ایسی دلیلوں کو اختیار کیا ہے جو اس سے پہلے مسلمان مفکر ابن رشد پیش کرچکا ہے، جو شخص بھی ابن رشد کی کتاب 'کتاب الفلسفہ' اور خاص طور پر اس کے ایک باب 'فصل المقال فی موافقۃ الحکمۃ والشریعۃ'[2] اور اسکی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۸) پیرس نے "ابن رشد" تعلیمات کی مذمت کی تھی، اسی جامعہ نے ایک صدی بعد ابن رشد ہی سے یہ فیضان حاصل کیا کہ اس نے نہ صرف ارسطو کی تعلیمات سے ہم آہنگ فلسفہ بلکہ اس فلسفہ کی جس کی تشریح ابن رشد نے کی ہے تعلیم دینے کی قسم کھائی، ملاحظہ ہو ریش ڈل کی کتاب 'جامعات' ص ۳۶۸

(حواشی صفحہ ہذا) [1] پیرس ۱۶۵۱ء ص ۱۰۲، [2] فاضل مقالہ نگار نے یہی عنوان دیا ہے، لیکن اس کا صحیح عنوان ہے فصل المقال فیما بین الحکمۃ والشریعۃ من الاتصال" (مترجم) فرانسیسی میں ابن رشد کی اس کتاب کے ترجمے ل۔ گوتھر نے Traité d'Ibn ... Accord et de la philosophi کے نام سے کیے ہیں، اسپینی زبان میں لکھی ہوئی پروفیسر آسن کی کتاب Homenagia Roch (D. Francisco Corera, Madrid) دیکھیے جس میں نہایت قابل قدر تاریخی اور تنقیدی تجزیہ اور سینٹ تھامس سے تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسری کتاب "تہافت التہافت" کے وہ حصے جس میں اس نے فلسفیوں پر غزالی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، پڑھنے کی زحمت گوارا کرے تو اسے فوراً ہی یہ محسوس ہو جائے گا اور وہ مطمئن ہو جائیگا، کہ ابن رشد اس خاص قسم کی عقلیت کا سخت مخالف ہے، جو مغرب میں "ابن رشدیت" کے نام سے مشہور ہے،

ابن رشد اور سینٹ تھامس کے نقاط نظر میں جو یکسانیت نظر آتی ہے، وہ ذہنی اتحاد خیال سے بڑھ کر محسوس ہوتی ہے، مثلاً موقع و محل پر دلیل پیش کرنے کا عزم، قدماء کے فلسفہ سے استفادہ اور آنے والی صدیاں اس فلسفہ کے نتائج پر جب تنقید کی متقاضی تھیں، بعض اوقات ان کا پیش کرنا، تصوف اور عقلیت (عقلیت نے ادیان منزلہ کے عقیدے ہی کی جڑ کاٹ رکھی تھی) کے مسئلہ میں ایک درمیانی راستہ اختیار کرنا وغیرہ مقاصد اور محرکات نصرانی حکیم (سینٹ تھامس) اور اسلامی مفکر (ابن رشد) میں مشترک تھے، دونوں کو ایک ہی گوشے سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور یہ وہ جماعت تھی جو الٰہیاتی مسائل پر مشائی یا ارسطاطالیسی نظریات کے انطباق کی مخالف تھی،

نصرانی حکیم (سینٹ تھامس) نے عقل و عقیدے کے موضوع پر جو مشہور ابواب لکھے ہیں جن میں وحی کے ذریعہ منکشف شدہ اسرار الٰہیہ کے درک میں عقل کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے، ان کا جواب قرطبی حکیم (ابن رشد) کے پاس "الدفاع عن حیاتہ" (Apologia provita sua) میں مل جاتا ہے، ان دونوں کے نزدیک علی الترتیب انجیل اور قرآن میں حق منزلہ اور فلسفہ کے درمیان اختلاف ناقابل تصور ہے، جہاں کہیں بھی حقائق منزلہ اور حقائق فلسفہ میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے، وہ تضاد نہیں بلکہ قاری کی غلط تعبیر ہے، نص کے سیدھے سادے اور لغوی معنی ہمیشہ درست نہیں ہوتے، خاص طور پر وہاں جہاں

خدا کو آدمی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے،

سینٹ تھامس ہمیشہ کامیابی کے ساتھ ایسے نصوص کی تاویل کرتا رہا جو اس کے نتائج سے متعارض نظر آتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مستند تمثیلی تعبیروں سے کام لیتا تھا، انجیل ہی اس بات کی ضامن تھی کہ فلاں بیان یا فلاں عقیدہ درست ہے، لیکن صرف کلیسا ہی کو اس کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا کہ انجیل کی کسی نص کی کس طرح تاویل کی جائے، ظاہر ہے ابن رشد کو اتنی آزادی حاصل نہیں تھی، اس پر بھی وہ جتنی دور جا سکتا تھا، جانے کی کوشش کی ہے، جہاں تمثیلی تاویل ناگزیر ہے، اور نص کے سیدھے سادے معنی ترک کر دینا ضروری ہے، یا جو جاہل اور خام کار نص کے اندر مخفی فلسفیانہ معنی کے درک کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور جس سے اگر کہا جائے کہ نص قرآنی لغوی معنی میں درست نہیں تو اس کا ایمان تباہ ہو جائے، ایسی صورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ابن رشد نے کچھ اصول وضع کیے ہیں، بعض معترضوں کے جواب میں اس نے اس سے انکار کیا ہے کہ اجماع (یعنی اسلام میں وہ نقطۂ نظر جسے "سب لوگوں نے ہر جگہ اور ہمیشہ تسلیم کیا ہو") ہمیشہ حجت ہے، اگر یہ بحث اٹھائی جائے کہ بعض ایسی نصوص بھی ہیں جن کے لفظی معنی ہی مسلمان قبول کرتے ہیں اور دوسری نص کی تاویل پر بھی متفق ہیں تو ایک نص پر ایک اصول کا اطلاق اور دوسری پر دوسرے اصول کا اطلاق درست نہیں، ابن رشد اس بحث کا یہ جواب دیتا ہے کہ اگر اہل دینیات کسی نص کی تاویل متعین کر بھی دیں تو ان کا ایسا کرنا جائز نہ ہو گا، البتہ اگر اس طرح کے ظن کی گنجائش ہو تو جائز ہو گا، ابن رشد کا خیال ہے کہ بہت ہی محدود صورتوں کے سوا کسی عہد میں بھی یہ کہنا ممکن نہ ہو سکا کہ کسی مسئلہ پر تمام علماء کو اتفاق رہا ہے،

نصرانی "ابن رشدیوں" کو مشائی مطالعات میں اپنے استادوں کی سی آزادی

حاصل نہ تھی، اس لیے ان لوگوں نے ابن رشد کے نظریات میں بہت سے خرافات اپنی طرف سے بڑھا دیے، ابن رشد نے کہا تھا کہ قرآنی تاویل کا فن جاہل عوام الناس کے بس کی بات نہیں، اس سے بہتر یہی ہے کہ انھیں اپنی خام خیالیوں پر ہی قائم رہنے دیا جائے، البتہ فلسفی کو عقل کی روشنی میں اس نص مقدس کی تاویل کی اجازت ہونی چاہیے، ایسی صورت میں قرآن کے الفاظ اور تعلیم یافتہ لوگوں کے عقائد میں تضاد پیدا ہو جائے گا، لیکن ایسا تضاد اس دلیرانہ نظریہ کو مستند نہیں بنا سکتا کہ ایمان ایسے دعووں پر یقین کرنے کا مطالبہ کرتا ہے، جس کو عقل صحیح تسلیم نہیں کر سکتی، ابن رشد کے ناقص اور غیر مستند لاطینی ترجموں ہی نے "دہری حقیقت" کے نظریہ کے مصنف ہونے کی ذمہ داری عربوں کے سر ڈال دی ہے، کیونکہ مترجم اکثر ایسے الفاظ کے اصطلاحی معنی سے ناآشنا تھے، جو تشبیہاً اور مجاز کے طور پر استعمال کیے گئے تھے، "تشبیہہ" اور "مجاز" یا "مثال" کے معنی حقیقت سے الگ افسانے کے لیے جاتے تھے، ابن رشد نے مجازی تاویل کے جواز کا فتویٰ دے کر دین سے انحراف نہیں کیا، کیونکہ اس کے ہم مذہبوں نے ان نصوص کے بارے میں جو اس نے بطور مثال چنے ہیں، چاہے کچھ ہی سوچا ہو، ابن رشد ایک ایسے اصول کا انطباق کر رہا تھا جو نصرانیت اور اسلام میں ابتدا ہی سے موجود تھا،[1]

سینٹ تھامس کے فلسفۂ دینیات اور ابن رشد کی فکر میں بہت سی مشابہتیں ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم یہ عقیدہ اور اس کے دلائل ہیں کہ خدا کا علم تمام جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، نصرانی عالم سینٹ تھامس کا یہ مشہور دعوی کہ اللہ کا علم موجودات کی علت ہے،

[1] ملاحظہ ہو انجیل متی میں فقرہ ۷، آیت ۶۔ قرآن مجید میں سورہ ۳ آیت ۵ ابن رشد "فصل" ص ۸ Sum Theol ص ۱ و مابعد

ابن رشد کے اس دعوے کے سوا اور کچھ نہیں کہ "العلم قدیم ھو علة وسبب للموجود"[1] مسلمان مشائیوں کو اس بات سے انکار تھا کہ اللہ کے علم میں تمام جزئیات ہیں، ان کی دلیل یہ تھی کہ معلوم میں تغیر سے عالم میں تغیر لازم آتا ہے، اس سلسلہ میں غزالی کا یہ جواب تھا کہ عالم سفلی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اگر اللہ نہ دیکھ سکے یا نہ سن سکے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ جو خود سماعت اور بصارت کا خالق ہے، اپنی مخلوقات سے بھی گیا گزرا ہوا،

ابن رشد اور سینٹ تھامس میں اتنی زیادہ مشابہتیں ہیں جو محض اتفاقی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور ثابت کرتی ہیں، فلسفہ اور الہیات میں مطابقت کی خواہش تنہا کچھ ایسی اہمیت کی حامل ہیں، بلکہ جب متوازی خطوط پر کام کا نقشہ بنتا ہے تو قدرتی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے، ابن رشد نے نصرانی علمی دنیا کو ارسطو کی شرح سے بڑھ کر چیزیں عطا کی ہیں، دونوں مصنف عقائد میں فلسفیانہ دلائل کے بعد قرآن یا انجیل سے استشہاد کرتے ہیں، دونوں اپنی بحث کا آغاز مشتبہ یا بظاہر متناقض آراء سے کرتے ہیں، دونوں کے یہاں خدا کے وجود کا ایک ہی ثبوت ملتا ہے، یعنی حرکت اور عالم کی فکری رہبری۔ دونوں خدا کی وحدانیت پر وحدت عالم کی دلیل لاتے ہیں، اس دعوے کے پیش کرنے میں کہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اس کی تنزیہ پر ایمان لازمی ہے، دونوں قیاس سے کام لیتے ہیں،

اس قبیل کی اور مشابہتیں بھی ہیں، ایسی بہت سی مشابہتیں مشرق اور مغرب کے مسلمان مصنفوں میں پائی جاتی ہیں، لیکن فلسفیانہ اور دینیاتی فکر نے مشرق سے نکل کر مغرب میں پہنچنے میں جو جو راستے اختیار کیے ہیں اس پر ہم کافی بحث کر آئے ہیں،[2]

[1] ملاحظہ ہو "ضمیمة المسألة التی ذکرھا ابو الولید فی فصل المقال" مرتبہ اسین (Asin) ریمونڈ مارٹن نے اس رسالے کا ترجمہ کیا تھا اور اسے اپنی کتاب "مذاہب کا خنجر" میں شامل کیا تھا، ملاحظہ ہو 'Pugio' کا حصہ اول باب ۲۵

کے بعد سے ابن رشد کی تعلیقات کو مغربی قارئین کے لیے مائیکیل اسکاٹ (Michael Scott) نے طلیطلہ میں قابل حصول بنا دیا تھا، ابن رشد کے بہت سے افکار کو ابن میمون نے اپنی اس اہم کتاب میں نقل کیا ہے جس کے حوالے بعض جگہ سینٹ تھامس نے دیے ہیں، سینٹ تھامس نے اپنی کتاب "مسائل جدلیہ" (Quaestiones Disputate) میں علم الٰہی کے بارے میں اختلاف رائے کے سلسلہ میں ابن رشد کے بیانات کا حوالہ دیا ہے،

اس مضمون کو سینٹ تھامس اکیوناس پر ختم کرنا مناسب ہوگا کیونکہ اسلامی "اثر" کا ٹھیک ٹھیک اندازہ سینٹ تھامس کی تحریروں ہی میں ہوتا ہے، ہم اس کی تحریروں میں عربی اثرات کا سراغ لگا چکے ہیں، لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اس نے صرف عربی مصنفوں پر ہی اکتفا کیا ہے، اور اسے کسی ایک مکتب یا کسی ایک صدی کا متبع قرار نہیں دیا جا سکتا[1] اس کی یہ عادت کہ وہ اپنے دور کے مروجہ تصورات سے پلٹ کر قدیم آبائے کلیسا سے رجوع کرتا ہے، اس کی قابل قدر شہادت ہے کہ مغرب عربوں کے واسطے سے اپنی گمشدہ میراث حاصل کر رہا ہے، اس لیے عربوں کے کارناموں کی قدر و قیمت یا اس کی تحسین میں کوئی کمی نہیں آئی، عربوں نے علم کے نور کو روشن رکھا اور خالص فلسفیانہ فکر کی ترقی میں ان کا حصہ خواہ کتنا ہی کم رہا ہو، مگر الٰہیات کے سلسلہ میں ان کی خدمات بیش قرار ہیں[2]

[1] سینٹ تھامس نے اپنے ماخذوں سے بیانات نقل کر کے محض ان کی کورانہ تقلید نہیں کی ہے بلکہ ہر مسئلہ کو اپنے طور پر سوچا ہے آزادانہ فکر سے کام لیکر ان کے ماخذوں سے اختلاف بھی کیا ہے اور جو کچھ بھی قبول کیا ہے وہ سنجیدہ تنقید اور بالغ نظری کا ایک شاہکار ہے۔ کلیمنٹ، سی، جے، ویب کی کتاب "تاریخ فلسفہ" ص ۱۲، لندن ۱۹۱۵ء،

[2] جوہر کے بارے میں مسلمان فلسفیوں کا نظریہ "خلق استمرار" اور "زمان جوہر" عصر حاضر کیلئے خاص طور پر دلچسپ چیز ہے، ملاحظہ ہو ابن میمون کی کتاب "دلالۃ الحائرین" ترجمہ فری ڈلینانڈر (Friedlander) لندن ۱۹۲۵ء

(باقی حاشیہ ص ۱۲۵ پر)

ہمیں یقین ہے کہ جو لوگ مسلمان عالموں پر جدت کے فقدان اور ذہنی تنزل کا الزام لگاتے ہیں، انھوں نے نہ کبھی ابن رشد کو پڑھا ہے اور نہ غزالی کا مطالعہ کیا ہے، بلکہ دوسروں سے سنی ہوئی باتوں پر رائے قائم کی ہے، مغربی نصرانیت کے ہر قلعہ میں اسلامی اصل کے عقائد کی موجودگی، سینٹ تھامس اکیوناس کی کتاب "الرد علی الامم" (Summa) جدت کے فقدان اور ٹھیراؤ کے الزام کی تردید کے لیے کافی ہے،

اسلامی اثرات کے بہت سے مظاہر کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے قرون وسطی کی ثقافت کی تاریخ لکھنی ہوگی، بہت سی دور رس بحثوں کو چھوڑنا ہوگا، جب قومی ثقافت کے دھارے یہ کہ انسانی فکر کے وسیع سمندر میں آملتے ہیں، اور وہ ایک بار سمندر میں پہنچ جاتے ہیں تو تازہ وادی دھارے کے پانی اور سمندر کے نمکین پانی کو ایک دوسرے سے ممیز کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے اور ہر شخص کو بس اپنے ہی ذائقہ پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے،

مسلم اقتدار کی چار صدیوں یا اس سے کچھ زیادہ مدت میں تمام علمی مرکزوں میں دینی یا فکری تحقیق کی روح بیدار نظر آتی ہے، اور اس دور کی تحریروں میں اب بھی مشرقی ذہن کی مخصوص رنگینی اور دلکشی کی چھاپ دکھائی دیتی ہے، اس دور میں جب ہر تاجر شاعر ہوتا تھا، مگر سب شاعر تاجر نہ ہوتے تھے، مطالعہ سیر و سیاحت، معرکہ آرائی، عشق و محبت، نغمہ موسیقی وغیرہ اللہ کی نعمتیں مانی جاتی تھیں، زندگی مختصر تھی، خصوصاً جب تخت شاہی کے قرب یا دربار میں بسر ہوتی تھی لیکن یہ زندگی پرلطف تھی، اگر ایسے عہد میں دینیاتی مسائل غیر متعین رہ گئے تو اس میں کیا تعجب ہے، تشکیک ایک طرح کے صوفیانہ وحدت الوجود میں پناہ لیتی ہے"

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۴) ص ۱۳۰ و ما بعد اور مجلہ ایزیس (Isis) میں ڈی، بی، میکڈانلڈ کا مضمون جلد ۹ شمارہ ۲۵ ۱۹۲۷ء ص ۳۲۶ و ما بعد

یہاں بھی ایسا ہی ہوا، اس وحدت الوجود نے ان اللہ یحل فیہ وانہ یحل فی اللہ کا
نعرہ بلند کیا، اپوکالپ ٹسٹ (Apocalyptists) اور اسین (Essene)
کے پیرو انبیا، کے جذب کا دعویٰ اور سخت سے سخت ریاضتیں کرتے تھے، مشرق سے یہ چیزیں
یورپ میں درآمد ہوئیں اور البگ جنس (Albigensis) اور کھتاری (Cathari)
کے لیے نمونہ بنیں اور ان کی آتش شوق کو اور بھڑکایا، اور جس طرح یہودی مسیح کے منتظر ہیں
اسی طرح مسلمان مہدی کے منتظر اور اہل سنت حوروں کی جنت میں ٹھوس نعمتوں اور ابدی
سعادتوں کے خیالوں میں گم ہوگئے، ابن حزم قرطبی جیسے نچلے نہ بیٹھنے والے عالم نے یورپ
کی پہلی بسیط "تاریخ مذاہب" اور عہد نامۂ قدیم وجدید پر اولین اور اعلیٰ درجے کی
ناقدانہ کتاب لکھ ڈالی، واہمہ حقایق کے ساتھ آمیز ہو سکتا ہے، اور تخیل زندگی کی روزمرہ باتوں
کو چمکا دے سکتا ہے، اسی طرح ابن العربی جیسے لوگوں نے "طربیہ خداوندی"[1] کے ابتدائی
حیرت انگیز نمونے تیار کیے،

زبان کی رکاوٹوں کی وجہ سے ہمارے اسلاف کے لیے اس متنوع اور ہمہ گیر زندگی
کے تھوڑے سے حصہ ہی سے استفادہ کرنا مقدر تھا، اس طرح جب یورپ میں اسلامی
سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو وہ تمام علوم جو ابھی تک اہل یورپ کے علم کا جزء بننے نہیں پائے
تھے شکست خوردہ مسلمانوں کے ساتھ دیس باہر کر دیے گئے، لیکن اس کے باوجود تیرہویں
صدی میں مشرق اور مغرب ذہنی طور پر ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ اتنے قریب
کبھی نہ ہوئے تھے، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، تثلیث اور تجسیم کے بنیادی عقائد کے سوا
متکلموں کو حزب مخالف میں اتنا اختلاف نظر نہیں آتا تھا جتنا کہ اپنی جماعتوں کی صفوں

[1] اطالیہ کے مشہور شاعر دانتے کی نظم Divina Commedia (مترجم)

دکھائی دیتا تھا، یورپ کے کتب خانوں میں جو زبردست مسالہ موجود ہے وہ جب منظرِ
عام پر آئے گا تو معلوم ہوگا کہ قرون وسطیٰ کے تمدن پر عربوں کا اثر اس سے بھی کہیں زیادہ
ہے، جتنا کہ اب تک تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

حوالے | اس مقالے کو اس سلسلہ کی کتاب "ورثۂ اسرائیل" کے مقالہ "قرون وسطیٰ کی فکر
میں یہودیوں کا حصہ" کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے جو س، د، سنگر (C. D. Senger)
کا لکھا ہوا ہے،

۱- س، منک "مجموعۂ فلسفۂ یہود وعرب" (فرانسیسی)، پیرس ۱۸۵۷ء
بار دوم ۱۹۲۷ء

۲- م، ہارٹن "اسلام میں فکری الٰہیات کا نظام" (جرمن) بون، ۱۹۱۲ء،

۳- بیرن کیارادے وہ "غزالی" (فرانسیسی) پیرس ۱۹۰۲ء،

۴- م، آسین "الغزالی" (اسپینی) سراقوطہ، ۱۹۰۱ء

۵- ایضاً "سینٹ تھامس اکیوناس پر ابن رشد کے مذہبی اثرات،
(اسپینی)، سرقسطہ، ۱۹۰۴ء،

۶- ایضاً- "ابن مسرہ اور اس کا مکتب" (اسپینی) میڈرڈ، ۱۹۱۴ء

یہ کتابیں نہایت درجہ اہم ہیں،

فلسفہ قرون وسطیٰ کی تاریخ پر مضامین:

۷- م، وٹ من: "سینٹ تھامس اکیوناس کا موقف ابن جبیرول کے مقابلے
میں" (جرمن)، منسٹر، ۱۹۰۰ء

۸- ایضاً: "عربی فلسفہ کے ارتقا میں ابن جبیرول کا درجہ" (جرمن)

۹۔ سپچنے ور: "ارسطاطالیسی اور عرب یہود فلسفہ اور بارھویں صدی کی مغربی فکر کا تقابل" ۱۹۱۵ء (جرمن)

۱۰۔ ای. گِل سَن: "سینٹ تھامس نے کیوسینٹ اگسٹائین پر اعتراض کیا" (فرانسیسی)، رسالہ قرون وسطیٰ کی ادبی و مذہبی تاریخ، پیرس، ۱۹۲۶ء، ص ۵ و ما بعد۔

۱۱۔ سی. ر. س. ہیارس: "ڈنس اسکوٹس" (لاطینی) آکسفورڈ، ۱۹۲۷ء

۱۲۔ س. فان ڈن مرہ: "ابن رشد کے فلسفہ مابعد الطبیعیات کا خلاصہ" (جرمن) لیڈن، ۱۹۲۴ء۔

۱۳۔ ڈی لے اولری: عربی فکر اور اس کا مقام تاریخ میں، (انگریزی) لندن ۱۹۲۲ء

۱۴۔ کلیمنٹ س. ج. وب: فطری دینیات کا مطالعہ" (انگریزی) آکسفورڈ ۱۹۱۵ء۔

دارالمصنفین کی نئی کتاب

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ

کی

ایک ایک جھلک

جس میں تیموری عہد سے پہلے کے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی کہانی ہندو اور مسلمان مورخین کی زبانی بیان کی گئی ہے۔

مُرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن، ایم۔ اے،

"منیجر"

مکتوبات شیخ الاسلام مولانا مظفر شمس بلخی

اور

سُلطان غیاث الدین بنگالہ

از مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

مکتوبات کی افادیت اور مولانا کے مکتوبات

مکتوبات کی اہمیت و افادیت طالبان حق مسترشدین اور مؤرخین و محققین کی نظروں میں جیسی کچھ ہے ظاہر ہے، اگر ایک طرف اس سے مسترشدین استفادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف مؤرخین ان کے ذریعہ دادِ تحقیق دیتے ہیں، نیز ان مکاتیب سے صاحب مکاتیب کے دور کے علماء و فضلاء، عرفاء و صوفیاء، امرا و سلاطین کے حالات اور کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس زمانہ کی ثقافت و سیاست کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے، حضرت مولانا بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے[1] مکتوبات سلوک و معرفت کا گنجینہ، علم و ادب کا خزینہ اور اس زمانہ کی ثقافت کا ایک نادر مرقع ہیں، یہ ایک سو اکاسی مکتوبات کا مجموعہ ہے۔

مولانا کے مکتوبات کا دوسرا مجموعہ

مولاناؒ کے مکتوبات کا ایک اور مجموعہ بھی تھا، چنانچہ مکتوب صد و شصت و سوم در جواب عریضہ سلطان غیاث الدین میں ارقام فرماتے ہیں کہ

"مکتوبات من نیز قریب مجلدے خواہد بود در ہندوہ و معظم آباد یا دنمی آید، بر کیا نسخت دستور حاصل تواند کرد اگر حاصل شود مطالعہ کنند"[2]

مولانا کی زندگی سراپا قلندرانہ و درویشانہ تھی، کسی شاہ و گدا اور امیر و وزیر سے نیاز مندانہ

---

[1] مولانا ممدوح پر راقم سیچمدان کے قلم سے ایک مضمون معارف بابت ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] مکتوبات صد و چہار و نہم و صد و پانزدہم۔

ربط نہیں رکھا، چنانچہ مکتوب بنام مولانا کریم الدین میں رقم کرتے ہیں: "امراء، وزراء، ملوک و سلاطین کے درمیان روشناس ہونا اور ان کی بارگاہ عالی میں اعتبار و وقار حاصل کرنا نہ اب ہے اور نہ پہلے تھا، اس لیے ان سے مکاتبت میں میں پرہیز کرتا ہوں، اور یہ خواہش ہے کہ وہ میرے دل سے اور میں ان کے دل سے فراموش ہو جاؤں، میں ایک بے سر و پا، بے خانماں، دنیا سے کنارہ کش کنج نشین ہوں، اولاً میرے دامن سے کوئی ایسا شخص وابستہ نہیں جس کا نفقہ شرعی حیثیت سے فقیر پر واجب ہو، اور جو وابستہ ہیں وہ میری بے نوائی میں شریک ہیں، یہ بے تعلقی حضرت شیخ کا صدقہ ہے"[1]

اور جن سے خط و کتابت کرتے تھے، اس سے مقصود اصلاح و تربیت ہوتی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"مقصود آنکہ دوم آں فرزند است کہ باطن بروی کشاید تا ایں ہمہ اسرار بروی ریزم"

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں کہ

"عزیزے و دوستے چوں آنجانب میرود بالتماس او نوشتہ می آید"[2]

ان ہی وجوہ کی بنا پر آپ نے سلطان غیاث الدین بنگالہ سے مکاتبت فرمائی ہے، مولانا اور سلطان کے درمیان دنیاوی رشتہ سے زیادہ استوار ایک روحانی رشتہ تھا، سلطان ممدوح کے نام مولانا کے مطول و مختصر گیارہ مکتوبات مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، اسی روحانی رشتہ کی بنا پر مولانا سلطان کو فرزند اور فرزند برخوردار، برادر عزیز اور دوست عزیز کے مخلصانہ الفاظ سے خطاب کرتے ہیں،

مکتوبات کے جامع و مرتب اور وجہ جمع و ترتیب

مکتوبات کے جامع و مرتب حضرت شیخ الاسلام مولانا حسن صنیر بلخی المعروف[3] نوشتہ توحید ہیں، جن کے مولانا سے چند در چند تعلقات تھے یعنی برادر زادگی

[1] مکتوب صد و شصت و سوم [2] مکتوب صد و پانزدہم [3] حضرت نوشتہ توحید پر بندہ ہیچمدان کے قلم سے مضامین معارف بابت ماہ مارچ و اپریل ۵۶ء شائع ہو چکے ہیں،

تبنی، تلمذ، ارادت و خلافت،

مکتوبات کے دیباچہ میں حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ

می گوید بندۂ درویشاں و فدائے بندگان ایشان حسن صنیر غفر اللہ لہ ولوالدیہ چوں جماعتے از طالبان جمال ذوالجلال را باعث شوق و جاذبۂ ذوق در اہتزاز آورد خواستند کہ اسرار معرفت محبوب برایشان کشف شود و باخلاص در کار آیند و بجان طالب اسرار شوند و دل از ما سوا اللہ خالی کنند، التماس کردند کہ اسرار کلمات را بواسطہ وصول مکاتبات ادراک کردند، بندۂ درویشاں آں مکتوبات متفرقہ را در مجلدے جمع کردہ تا مطالعہ ایں مجموعہ بر معتقدان و طالبان را موجب ترقی درجات باشد و مؤلف بیچارہ را سبب نجات گردد والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد و آلہ اجمعین"

اس مخطوطہ مکتوبات کے شروع اور آخر میں چند مہریں ثبت ہیں اور کچھ عبارتیں بھی مرقوم ہیں، اختتام تحریر "تمّ مطابق باصلہ سنہ ۱۱۰۰ھ بید الفقیر غلام یحییٰ اللّٰہم یسّر لی خطاً او فرحماً فیہ بفضلک و فضلک" مہروں کے حلقہ میں غلام یحییٰ منقوش ہے، آغاز صفحہ اول پر مہر کے ذیل میں[1]

[1] مولانا قاضی غلام یحییٰ بہاری المتوفی سنہ ۱۱۸۶ھ، مختلف مقامات میں عہدۂ قضا پر مامور رہے، چنانچہ جامع مکتوبات سے آپ کے نسبی تعلقات بھی ہیں، آپ کے اسلاف و اخلاف سبھی اپنے دور کے مشاہیر علماء و فضلا میں سے تھے، اور عہدۂ قضا پر مامور تھے، سلسلۂ نسب یہ ہے، غلام یحییٰ ابن غلام شرف الدین المتوفی سنہ ۱۱۴۸ھ ابن ملا محمد رقیب ابن ملا عبد العلیم یا عبد الحلیم المتوفی سنہ ۱۰۹۰ھ ابن ملا عبد الشکور المتوفی سنہ ۱۰۳۲ھ مزار منیر شریف میں ہے، سلسلۂ اخلاف: مولانا قاضی کمال الحق المتوفی سنہ ۱۲۲۵ھ قاضی اورنگ آباد وغیرہ و مولانا قاضی امین الحق المتوفی سنہ ۱۲۳۷ھ و مولانا قاضی محمد اسمٰعیل المتوفی سنہ ۱۲۹۱ھ قاضی اورنگ آباد آپ کے قلم سے کتاب کحل العینین فی مناقب غوث الثقلین اور گلشن قدسی تین جلدوں میں ہے، راقم کے کتاب خانہ میں موجود ہے، آپ کے اخلاف میں قاضی عبد الودود پٹنہ اور قاضی محمد سعید و قاضی فرید موجود ہیں، اور ملا غلام یحییٰ بہاری کے اخلاف میں قاضی واعظ الحق المتوفی بمکہ سنہ ۱۲۹۷ھ ابن امین الحق کی اولاد و احفاد میں مولوی فصیح الدین بلخی مصنف تاریخ مگدہ و بہار و تذکرۂ نسواں وغیرہ بقید حیات ہیں،

ایک مقام پر "للفقیر غلام یحیٰی ابن شرف الدین احمد بہاری"، اور دوسری جگہ رقم ہے "این نسخہ مکتوبات شریفہ مدتے در تصحیح و مطالعہ احقر انام عاصی عظیم المعاصی غلام یحیٰی بہاری بود بولد اعز کمال الحق عظمۃ اللہ تعالیٰ و سلمہ فی مرضیاتہ بخشیدہ شد حق تعالیٰ بطفیل پیران فردوسیہ او را بہرہ مند ساز د بمنہ و کرمہ"،

مولانا کا طرز مکاتبت

مولانا کے مکاتبت و مخاطبت کا طرز عالمانہ و صوفیانہ ہے، آیات، احادیث، ابیات و کلمات عارفانہ، شریعت و طریقت کے بصائر و حکم کا بیان ہے، اور ان میں انشاپردازی کے محاسن پوری طرح نمایاں ہیں،

مکتوب صد و شصت و سوم در جواب عریضہ سلطان غیاث الدین[1] کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں

اے دوست تحقیق بدان کہ بفضل اللہ کلمات من مستنبط از کتاب و سنت و مبنی بر کتاب و سنت است الا آنکہ اثر در ہر کلمہ آیتے و حدیثے آرم وقت ضیق است فرصت وفا نہ کند،

مضامین مکتوبات

مکتوبات کے مضامین ظاہر و باطن، قلب و قالب، شریعت و طریقت، سیاسیات شرعیہ اور ثقافت ملکیہ و قومیہ پر مشتمل ہیں، ایک جگہ بعنوان حدیث رقم فرماتے ہیں،

جس طرح پدر شفیق کی پدرانہ شفقت فرزند عزیز کو امور دینی و دنیوی سے آگاہ کرانے کی خواہشمند ہوتی ہے اسی طرح یہ روحانی باپ اپنے فرزند روحانی کے مکاتبت و مخاطبت میں ظاہر و باطن، دین و دنیا کے ایمان افروز اور حکمت آفریں امور سے آگاہ کرتا جاتا ہے، کہیں کہیں کتاب و سنت کی روشنی میں تبلیغ و جہاد کی بھی ترغیب اور ہدایت ہے کہ ممالک[2] اسلامیہ میں کافروں کا تسلط و غلبہ اور ان کو مسلمانوں پر آمر و حاکم اور ان کا والی و متولی بنا دینا اور رموز سلطنت سے آشنا کرنا اور اپنا محرم راز بنانا شرعاً ممنوع ہے،

سلطان کے اجداد

سلطان ممدوح حاجی الیاس[3] الملقب سلطان شمس الدین بھنگرہ کا نبیرہ اور

[1] مکتوب صد و شصت و سوم [2] بنگال و بہار [3] سلطان قطب الدین ایبک کے عہد ہمایوں میں اختیار الدین محمد (باقی حاشیہ ص ۱۳۳ پر)

اور سکندر شاہ کا فرزند ارجمند ہے، سلاطین بنگالہ میں سلطان شمس الدین بھنگرہ ایک اولوالعزم اور مدبر بادشاہ گذرا ہے، اپنے تدبر و اولوالعزمی سے اس نے سلطنت بنگالہ کو اس قدر وسعت دی کہ اڑیسہ اور شمالی بہار سے حدود بنارس تک[1] اپنی مملکت میں شامل کر لیا، شمالی بہار میں حاجی پور شہر[2] اس کے آثار باقیہ کا قصیدہ خواں ہے،

سلطان فیروز شاہ[3] بہار و بنگالہ کو چھیننے کے خیال سے بنگالہ روانہ ہوا اور پنڈوہ شہر کے متصل فیروز آباد میں خیمہ زن ہوا، اور جنگ آزمائی کے بعد دونوں میں صلح ہو گئی اور سلطنت دہلی اور حکومت بنگالہ کے حدود مقرر ہو گئے، سولہ سترہ سال حکومت کرنے کے بعد سلطان شمس الدین دنیا سے رخصت ہو گیا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۲) ابن بختیار خلجی کے ہاتھوں چھٹی صدی ہجری کے وسط یا آخر میں فتح ہوا، اور وہ اسی زمانہ سے تخت دہلی کے زیر حکومت رہا، فرمانروایان بنگالہ شاہان دہلی کی نیابت میں فرمانروائی کرتے تھے، ملک بیدار خلجی المخاطب بہ قدر خاں حاکم بنگالہ کے سلاحدار ملک فخر الدین حاکم بنگالہ کو قتل اور بنگالہ پر قبضہ کر کے خود مختار بن بیٹھا، ملک علی مبارک المخاطب سلطان علاء الدین فیروز شاہ کے معتمد ملازموں سے تھا، اور حاجی الیاس مذکور جو ملک علی مبارک کا کوکا اور رضاعی رشتہ دار تھا، فیروز شاہ کا بڑا مقرب تھا، دہلی سے فرار ہو گیا، اسکے فرار ہونے کی پاداش میں ملک علی مبارک عہدہ سے برطرف کر دیا گیا، برطرفی کے بعد وہ بنگالہ پہنچا اور شاہ بنگالہ کے دربار میں رسوخ پیدا کر کے تخت بنگالہ پر قابض ہو گیا، اسی کے دور حکومت میں حاجی الیاس موصوف پنڈوہ شریف پہنچا، ملک علی مبارک المخاطب بہ سلطان علاء الدین نے اسکو قید کر دیا، پھر اپنی ماں کی سفارش سے رہا کر کے کوئی عہدہ بھی عطا کیا، حاجی الیاس نے پھر چند دنوں میں اثر پیدا کر لیا اور فوج کو ہمنوا بنا کر سلطان علاء الدین کا کام تمام کر دیا اور خود تخت بنگالہ پر قبضہ کر کے سلطان شمس الدین بھنگرہ لقب اختیار کیا وجہ لقب بھنگ نوشی ہے (ماخوذ از ریاض السلاطین و فرشتہ و فیروز شاہی وغیرہ)

[1] تاریخ فرشتہ [2] تاریخ فرشتہ "حاجی پور از آثار حاجی الیاس است" [3] ریاض السلاطین و تاریخ فرشتہ۔

اس کے بعد اس کا فرزند عزیز سکندر شاہ[1] وارث تاج و تخت ہوا، اس کے دور حکومت میں بھی فیروز شاہ نے دوبارہ فوج کشی کی، دونوں میں مقابلہ ہوا، اور جنگ آزمائی کے بعد سکندر شاہ فیروز شاہ کے حضور میں گرانقدر تحفے پیش کرکے صلح کا خواستگار ہوا، اور نقد و جنس کی سالانہ ادائیگی کی شرط پر صلح ہوگئی، سکندر شاہ نو سال چند ماہ حکومت کرکے راہی ملک بقا ہوا، اس کی رحلت کے بعد اس کا لڑکا سلطان غیاث الدین ۷۶۶ھ میں سریر آرائے حکومت ہوا، اور باختلاف روایت آٹھ یا سولہ سال شرعی آئین و دستور کے ماتحت عادلانہ حکومت کی، بالآخر ایک بداندیش مسلم کش راجہ کانس (گنیش) زمیندار بھتوریہ کے ہاتھوں جام شہادت پی کر حیات جاودانی حاصل کی۔

سلطان کی تعلیم و تربیت

سکندر شاہ خود ذی علم اور دیندار تھا، اور علماء، و فضلاء، عرفاء و فقراء کا بھی قدردان تھا، اس لیے اس نے سعادتمند فرزند کی تعلیم و تربیت کے لیے مشہور و مقدس صوفی عالم حضرت شیخ حمید الدین ناگوری[2] کو متعین کیا، چنانچہ سلطان کی تعلیم و تربیت شیخ موصوف کی نگرانی اور پنڈوہ شریف کے مقدس بزرگ حضرت نور قطب عالم فرزند حضرت مخدوم علاء الحق کی رفاقت میں ہوئی، شیخ کی تعلیم و تربیت کی برکت سے دونوں تلامذہ میں علم ظاہر کے ساتھ علم باطن احسان و عرفان کا بھی ذوق پیدا ہوا، اور دونوں اپنے اپنے رنگ میں یگانۂ روزگار ہوئے۔

سلطان کی استعداد و صلاحیت

سکندر شاہ کی دو بیویاں تھیں، ایک سے سترہ اولادیں دوسرے سے صرف سلطان ممدوح تھا سلطان کی صلاحیت کی شہادت مورخ غلام حسین سلیم صاحب ریاض السلاطین ان لفظوں میں دیتے ہیں کہ

از زن دیگر یک پسر مسمی بہ غیاث الدین کہ در حسن اخلاق و جمیع اوصاف برہمہ برادران فایق و در امور سلطنت و جہانداری انسب و لائق بود"۔

ان اوصاف کی بنا پر سلطان کی زوجۂ اولیٰ غیاث الدین سے حسد کرتی اور اس کے درپے آزار رہا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے سکندر شاہ سے سلطان کی شکایت کرکے مشورہ دیا کہ اس کو قید یا اس کی آنکھیں نکلوا کر اندھا کر دیا جائے، سلطان نے جواب دیا:

چوں غیاث الدین پسر خلف است و لیاقت سلطنت دارد گو قاصد جان من باش

سلطان کی علمی و باطنی صلاحیتیں

مولانا موصوف نے بھی اکثر و بیشتر مکتوبات میں سلطان کی علمی و باطنی صلاحیتوں کی توصیف کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"در فرمان شاہ کہ مشحون و مملو بانواع دُر رو جواہر معانی بود ایں رباعی بود

اے مست شراب ذوق باطن | سرخوش بمدام شوق باطن
یکجرعہ بکام ایں گدا ریز | اے خسرو جوق جوق باطن

اگرچہ ہشیار بودم مرا ازیں رباعی مست کرد"۔[1]

اسی مکتوب میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ

گواہی می دہم کہ حق سبحانہ و تعالیٰ شاہ را از معانی خطے وافر عطا کردہ است و در فہم کلمات درویشاں و وقوف بمعانی و رموز آں نصیبۂ عظیم کرامت کردہ، او صورکمہ فاحسن صورکم" و آتکم الملک" اگر یوسف وار شاکر اُستاد گوید، رب قد اتیتنی من الملک وعلمتنی من تاویل الاحادیث شاہ را مسلم بود"

---

[1] سکندر شاہ بڑا دیندار تھا، پنڈوہ کے جنگلوں میں آبادی سے دور ایک مسجد، مسجد آدینہ نام کی ۷۶۵ھ و ۷۶۶ھ میں تعمیر کی تھی، صاحب ریاض السلاطین تحریر کرتے ہیں کہ فقیر آں را ملاحظہ کردہ الحق خوب مسجدے ساختہ و مبلغ خطیر در تعمیر آن صرف شدہ باشد سعی او مشکور بود[2] حضرت خواجہ معین الدین سنجری اجمیری کے خلفاء میں دو بزرگ شیخ حمید الدین ناگوری نام سے مشہور ہیں، ایک شیخ حمید دہلی، دوسرے شیخ حمید الدین صوفی ناگوری، ممکن ہو کہ یہی دوسرے بزرگ ہوں، اگر ایسا ہے تو شخصیت معلوم ہے،

[1] مکتوب صد و پنجاہ و یکم

ایک دوسرے مکتوب میں رقم طراز ہیں[1]:

بر روے زمیں بظن من از سلاطین روے زمین حق تعالیٰ این ہمہ نعمتہا آں فرزند را داده است که نیک قبول افتاده است دیگر بیچارگاں بداں مملکت ظاہر کہ کافراں را ہم خداے تعالیٰ داده است معزور مانده اند۔ ازیں ہمہ معانی نیک بے بہره اند ایں علم وجود وسخا و دل شیر و شجاعت عطاے رب العلمین بر تو شریف است اعملوا آل داؤد شکورا ایں را فراموش مکن

اسی مکتوب میں آگے فرماتے ہیں کہ

ترا بظن من باطن پاک و فہم معانی بسیار بعطاے رب العلمین افتاده است وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

ایک دوسرے مکتوب میں رقم کرتے ہیں کہ[2]

"بحمد اللہ ایں رکن زمین بادشاہ برخوردار ما را باد و ایں مملکت ظاہر است واز ملک باطن اخلاق حمیده محبت مشائخ و علما بالغًا ابلغ وجود و سخا و شجاعت وہمم عالیہ کہ "ان یحب معالی الامور ویکره سفافہا" ذات مبارک را مجموعہ صفات سینہ گردانید اشکروا نعمۃ اللہ

پھر تحریر فرماتے ہیں[3]،

قدم روندگان راه خداے چوں درویش دید حکم ہماے آسمان طایر یطیر بجناحیہ گیرد و سایۂ دولت بر تاج و افسر سلاطین اندازد۔

مولانا کی شفقت اور خیر خواہی | سلطان ممدوح کی باطنی صلاحیت اور قلبی سلامت کی بنا پر مولانا سلطان کے ساتھ اظہار شفقت اور دینوی و دنیاوی ہر مہم میں خیر خواہی فرمایا کرتے تھے، ایک

[1] مکتوب صد و سی و دوم [2] مکتوب صد و ہفتاد و ہفتم [3] مکتوب صد و شصت و سوم

مکتوب میں محبت و شفقت کا اظہار اس بیت سے کرتے ہیں[1]،

چنانی در دلم حاضر کہ جاں در جسم و خوں در رگ
فراموشم نہ وقتے کہ دیگر وقت یاد آئی

سلطان کی خیر اہی و دعا گوئی کا جذبہ اس قدر تھا کہ مکہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں سلطان کو تحریر کرتے ہیں کہ[2]

ایں بیچاره نذر کرده کہ در مقامات متبرکہ ہر کجا کہ برسد بادشاه را دعاے فرید و کشاد کار بکند انشاء اللہ تعالیٰ

ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے[3] کہ کسی موقع پر سلطان کو دشمنان اسلام سے محاربہ درپیش ہے اور سلطان ایک عریضہ ہمراه خلعت روانہ کرتا ہے، اور دعا کا طالب ہوتا ہے، مولانا جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ" فرمان حضرت اعلی لازال عالیا صادر ہو کر مطالعہ میں آیا، خلعت بھی وصول ہوا، میں نے اس کو زیب تن کر کے دوگانہ ادا کیا، اور شاہ برخوردار کے لیے عمر و سعادت مزید کی بارگاه الٰہی میں دعا کی اور فقراء کی دعا حسب ارشاد باری تعالیٰ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان الخ محل اجابت میں پہنچ کر دشمنان دین و ایمان کو مقہور و مخذول اور پراگندہ کر کے رہے گی اور جس طرح آیۂ کریمہ وظنوا انہم مانعتہم حصونہم من اللہ میں یہود بنو نضیر کے لیے وعید ہے، جنھوں نے مصطفیٰ علیہ السلام کو آزار پہنچایا تھا، اور وہ بفضل خدا محصور و مقہور اور مفتوح ہوئے، اسی طرح محاربین محصور، مقہور اور مفتوح ہو کر رہیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ بنده درویشوں کی جماعت کے ہمراه شب و روز دعا خوانی میں مشغول ہے، الامور مرہون بالمواقیت، پس حق تعالیٰ ہی فتاح ہے، اور مفاتیح غیب سے کشاده کار فرمائیں گے۔

[1] مکتوب صد و شصت و سوم [2] مکتوب صد و شصت و پنجم [3] مکتوب صد و پنجاه و چہارم

انشاء اللہ تعالیٰ ،

ایک دوسرے مکتوب میں رقم طراز ہیں[1] :

"وللدعوات تاثیر بلیغ" ایں فقیر با جماعتے از درویشاں در دعاے شاہ است بحق

اجیب دعوۃ الداع اذا دعان الخ حاجات و مہمات برآوردہ باد آمین بحمدہ تعالیٰ ۔

ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ[2]

"بخدمت نیکو محقق است کہ ایں فقیر بحد وجہ غایت محب آں فرزند و نیکو خواہ است

و حق محبت و نیکو خواہی حق گفتن و مصلحت باز نمودن والا خیانت است در حقوق محبت"

سلطان کا ذوق ادب سلطان علم و ادب کا ذوق سلیم رکھتا تھا اور نظم و نثر دونوں اسکو دستگاہ حاصل تھی ، خود شاعر اور شعراء کا قدر دان تھا ، اس کے دامن دولت سے ادباء و شعراء بھی وابستہ تھے ،

ایک بار سلطان 'بنگالہ کے مشرقی حصہ کی سیر و سیاحت میں مصروف تھا کہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہوگیا ، امید زیست باقی نہ رہی ، اس کی تین بیویاں بھی ہمراہ تھیں ، جن کے وصفی نام سرو ، گل ، لالہ تھے ، اس نے ان کو وصیت کی کہ اس کی وفات کے بعد وہی تینوں غسل دیں گی ، مگر اتفاق سے سلطان کو شفا ہوگئی ، اور وہ اس نامزدگی کو فال نیک تصور کر کے ان کی طرف بیش از بیش التفات کرنے لگا ، دوسری بیویوں نے از راہ حسد انھیں غسالہ کہنا شروع کیا ، ایک روز ان تینوں نے سلطان سے اس کی شکایت کی ، شاہ کی زبان سے برجستہ یہ مصرع نکل گیا ،

ع ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود

مگر اس کا دوسرا مصرع ذہن میں نہ آیا تو دربار کے شعرا کو طلب کر کے مصرع طرح پیش کیا ، مگر کوئی دوسرا دل پسند مصرع نہ کہہ سکا ، اس وقت اس مصرع کو اس دور کے شاعر بے بدل

[1] مکتوب صد و چہل و نہم [2] مکتوب صد و شصت و سوم

لسان الغیب حافظ شیرازی کے پاس قاصد کے ذریعہ مع تحفہ تحائف بھیجا ، اور حافظ کو بنگالہ آنے کی دعوت دی ، لسان الغیب نے برجستہ دوسرا دلچسپ مصرع کہدیا

ایں بحث با ثلاثہ غسالہ می رود

اور پوری غزل کہہ کر قاصد کی معرفت روانہ کردی ، اور صعوبت سفر اور کبر سنی کے باعث خود حاضری سے معذوری ظاہر کی ، صاحب ریاض السلاطین رقم طراز ہیں :

"سلطان را ایں مصرع بہ خاطر گذشت "ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود" مصرع دیگر نہ توانست بہم رسانید و از شعراے پایۂ تخت ہم کسے از عہدۂ مصرع دیگر نہ توانست برآمد ، پس سلطان مصرع خود را نوشتہ ، مصحوب رسول بخدمت خواجہ شمس الدین حافظ بہ شیراز فرستاد و خواجہ حافظ فی البدیہ مصرع دیگر فرمود "ایں بحث با ثلاثہ غسالہ می رود" و غزلے تمام بنام او گفتہ فرستاد ۔"

علامہ شبلی نعمانیؒ نے شعر العجم[1] میں حافظ شیرازی کے تذکرہ میں تحریر فرمایا ہے کہ سلطان غیاث الدین ابن سکندر شاہ فرمانروائے بنگالہ نے بھی جو ۷۶۸ھ میں تخت نشین ہوا تھا ، خواجہ کے کلام سے مستفید ہونا چاہا ، چنانچہ طرح کا یہ مصرع بھیجا اور خواجہ نے یہ غزل لکھکر بھیجی ۔[2]

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود	ایں بحث با ثلاثہ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند	زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں	خامش مشو کہ کار تو در نالہ می رود

احترام شرع اور عدل گستری صاحب ریاض السلاطین رقم طراز ہیں کہ

"الحق سلطان غیاث الدین بادشاہ خوب بود در متابعت شرع شریف سر مو قاصر نہ شد"

[1] شعر العجم جلد دوم ص ۲۲۴ [2] پوری غزل دیوان حافظ میں ردیف دال موجود ہے ،

اس کی تائید میں یہ سبق آموز واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک موقعہ پر اتفاقاً سلطان کا تیر بہک کر ایک بیوہ خاتون کے فرزند عزیز کو لگ گیا، بیوہ نے قاضی وقت مولانا قاضی سراج الدین کی عدالت میں استغاثہ کر دیا، قاضی صاحب کو پریشانی ہوئی کہ اگر بادشاہ کی رعایت کرتا ہوں تو خدا کی عدالت میں ماخوذ ہوتا ہوں، اگر بادشاہ کو طلب کرتا ہوں تو اپنے لیے خطرات ہیں، مگر عدل والصاف کے پیش نظر قاضی صاحب ایک پیادہ بادشاہ کی طلبی کے لیے روانہ کر دیا، اور خود درہ زیر مسند رکھ کر عدالت میں بیٹھا، عدالت کا پیادہ محل سلطانی کے قریب پہنچا تو حضور شاہ میں رسائی کی صورت نہ پاکر اذان دینا شروع کر دی، بادشاہ بے وقت اذان کی آواز سن کر موذن کو حاضر کرنے کا حکم دیا، حاجبوں نے لاکر حاضر کیا، بادشاہ نے اس سے اس بانگ بے ہنگام کا سبب دریافت کیا، اس نے بادشاہ کو محکمۂ قضا میں حاضر ہونے کا حکم سنایا، یہ سنکر سلطان فوراً اٹھا اور پیادہ کے ہمراہ عدالت میں حاضر ہو گیا، قاضی نے اس کے اعزاز واکرام کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور حاکمانہ انداز میں کہا کہ یہ بیوہ مستغیث ہے، یا اس کو راضی کر کے استغاثہ اٹھوا دیجیے یا سزا کے لیے تیار رہیے، چنانچہ سلطان نے بہت کچھ نقد دیکر بیوہ کو راضی کر کے قاضی سے عرض کیا "ایہا القاضی اینک ضعیفہ راضی شد" قاضی نے ضعیفہ سے پوچھا، تیری دادرسی ہو گئی؟ اور تو راضی ہے؟ ضعیفہ نے جواب دیا، ہاں میں دعوی اٹھا لینے پر راضی ہوں، ضعیفہ کا جواب سننے کے بعد قاضی بادشاہ کی تعظیم کے لیے اٹھا اور مسند پر بٹھایا، اس وقت بادشاہ نے بغل سے شمشیر نکال کر قاضی سے کہا کہ میں حکم شرعی کی تعمیل کے لیے حاضر ہوا تھا، اس وقت اگر آپ میری رعایت کر کے سر مو بھی حکم شرع سے تجاوز کرتے تو اسی شمشیر سے گردن اڑا دیتا، قاضی نے بھی مسند کے نیچے سے درہ نکال کر دکھایا کہ میں بھی درہ لیکر بیٹھا تھا، اگر آپ سے حکم شرع کی تعمیل میں ذرا بھی تقصیر ہوتی تو بخدا اسی درہ سے پشت سرخ و سیاہ کر ڈالتا، رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت، بادشاہ نے خوش ہو کر قاضی صاحب کو انعام واکرام سے نوازا،

دامن شرع سے تمسک اور حصن شرع میں پناہ جوئی کی تاکید کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ

ہر عیش کہ در پناہ مولیٰ راند ہنیئاً مریاً گوارا باد، ترعۂ فال آنفرزند مبارک و میمون باد بالنبی وآلہ الامجاد

سلطان کی عقیدت اور اظہار ارادت

پنڈوہ شریف کی روحانی فضا، باپ دادا کی سلامت قلبی، شیخ حمید الدین ناگوری کی فیض بخش تعلیم و تربیت، نور قطب عالم کی دلنواز رفاقت کا اثر سلطان ممدوح کے قلب و قالب، ظاہر و باطن دونوں پر پڑا اور اس میں زہد و ورع اور فقرا و عرفا سے محبت اور اصلاح کا پورا ذوق پیدا ہو گیا،

پنڈوہ شریف میں مخدوم جلال الدین تبریزی کے قدوم میمنت لزوم، مخدوم راجا بیابانی، مخدوم علاء الحق اور مخدوم نور قطب کی سکونت سے روحانی فضا پیدا تھی، سلطان شمس الدین مخدوم راجا بیابانی سے ایسی والہانہ عقیدت رکھتا تھا کہ جب فیروز شاہ پورے لشکر کے ساتھ سلطان کا قلعہ میں محاصرہ کیے ہوئے تھا، اسی زمانہ میں مخدوم شیخ راجا بیابانی کی وفات ہو گئی، سلطان یہ خبر سنکر فقیرانہ لباس میں قلعہ سے باہر نکلا اور نماز جنازہ میں شریک ہو کر پھر قلعہ میں لوٹ گیا، سکندر شاہ مخدوم علاء الحق سے عقیدت رکھتا تھا اور سلطان غیاث الدین ابتداً مخدوم نور قطب عالم سے عقیدت رکھتا تھا، صاحب ریاض السلاطین لکھتے ہیں

کہ سلطان غیاث الدین از ابتداے حال با حضرت نور قطب عالم قدس سرہ اعتقاد تمام داشت و مدت العمر در خدمت قطب عالم قاصر نہ شد۔

مولانا کے مکتوبات سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الاسلام قطب عالم مخدوم الملک اور خود مولانا مظفر شمس بلخی کے ارادتمندوں کی ایک جماعت چھگانوں، معظم آباد، پنڈوہ شریف

اور بنگالہ کے دیگر حصص میں پھیلی ہوئی تھی، جس سے حضرت مخدوم الملک اور مولانا مکاتبت فرماتے اور ان کے اصرار پر گاہے گاہے بنگالہ کا سفر بھی کرتے تھے۔ ان وجوہ سے مولانا کے علم و تقدس کی شہرت بنگالہ میں بھی تھی، اور سلطان ممدوح آپکے علم و تقدس سے بہت متاثر اور آپکا عقیدتمند تھا، چنانچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ظاہری و معنوی صحبت سے شرف یاب ہوا اور مکاتبات کے ذریعہ شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت کے اسرار و رموز حاصل کرکے دنیا و دین دونوں میں اعزاز و اکرام حاصل کیا،

مولانا کا سفر اور قیام بنگالہ سفر بنگالہ اور قیام بنگالہ کی بابت مولانا رقم طراز ہیں کہ

"ایں فقیر در شہر معظم آباد بفضل اللہ العظیم رسید مشیر زمام مرا بدست سایق قضا سایق است تا بفضل اللہ و کرم بکجا خواہد کشید"

سلطان کے اظہار ارادت کے بعد اس کی التماس و اصرار پر آپ نے بارہا پنڈوہ کا سفر کیا اور سلطان کے مہمان رہے، خود تحریر فرماتے ہیں

"اے مہمان شماست بکثرت مزاحمت تنگ نیاید

گر بخواہی کہ بجوئی دلم امروز بجوئے

ورنہ بسیار بجوئی کہ نیابی مارا"

ایک دوسرے مکتوب میں ہے

"از موسم جہاز چہار ماہ گذشتہ است ہشت ماہ ماندہ دریں مدت مہمان آستانہ ہمایوں اعلی لازال عالیا سیر کردہ بعد از چہار ماہ بجائے صحت یافتہ است"

(باقی)

قاسمِ کاہی کا وطن

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی

۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر ہادی حسن صاحب پروفیسر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک نہایت ہی مبسوط اور پر از معلومات مقالہ فارسی کے ایک غیر معروف شاعر کاہی کے حالات و آثار پر اسلامک کلچر میں شائع ہوا تھا، تین سال بعد انھوں نے اس کا دیوان بھی پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مملوکہ نسخے کی مدد نیز دوسرے ذرائع سے مرتب کرکے شائع کیا، اس مقالہ میں غالباً کسی اضافے یا اصلاح کی گنجایش نہ تھی، بقول ڈاکٹر نذیر احمد:

"انھوں نے (ڈاکٹر ہادی حسن نے) کاہی کے حالات بڑی توجہ سے جمع کیے.....

اور اس کے گمشدہ اشعار کا پتہ چلانے میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے"

پھر بھی ڈاکٹر نذیر نے اس کا استدراک دو قسطوں کے اندر معارف بابتہ اگست و ستمبر ۱۹۵۷ء میں شائع کیا ہے، ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی شخصیت اتنی معروف ہے کہ ان کا تعارف سوءِ ادب ہے، عہد حاضر کے فارسی اساتذہ میں انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے، وہ محقق نہیں بلکہ محقق گر ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب بھی نئے لوگوں میں اپنی محنت و جفاکشی اور کثرت مطالعہ کی بنا پر ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فارسی ادب کے ان دو استادوں کے مقابلہ میں راقم کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ ان دونوں کے درمیان مختلف فیہ مسائل پر محاکمہ کر سکے،

لیکن ان دونوں محققوں کی تحقیقات کے سلسلے میں ایک مسئلہ ایسا آگیا ہے جو فارسی ادبیات

کا نہیں بلکہ اسلامیات کا ہے ۔ کاہی خواہ ایران میں پیدا ہوا ہو یا توران میں ، اس اختلاف مولد سے اس کی فارسی شاعری پر کچھ اثر نہیں پڑتا ، اس لیے یہ مسئلہ کہ کاہی "میاں کالی" تھا یا "میاں کالا" فارسی ادب کا نہیں بلکہ ممالک اسلامیہ کے جغرافیہ کا ہے ، جو ایک فارسی ادب کے استاذ کے دائرے سے باہر کی چیز ہے اور اس کی تحقیق اسلامیات کے طالبعلموں کا حق ہے ، یہ عاجز بھی اسلامیات کا ایک ادنی طالبعلم ہے اور میرا موضوع تحقیق "امام اشعری اور اشعریت" ہے ، اس سلسلے میں "چوتھی صدی ہجری میں عالم اسلامی کی مذہبی حالت" کے ضمن میں جس کا مطالعہ اشعری افکار کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے میرے لیے ناگزیر تھا ، مجھے عالم اسلامی کے قدیم جغرافیہ کا خصوصیت سے مطالعہ کرنا پڑا ، کاہی کا وطن میاں کال ہو یا کوفن ، بہر حال اسی جغرافیائی خطے میں تھا جس کا تفصیلی مطالعہ میں کر رہا ہوں ، اس لیے مجھے اس مبحث پر کچھ کہنے کی جرأت ہوئی ، خصوصاً جب میں نے دیکھا کہ بحث جغرافیائی ادب سے ہٹ کر کتب لغت کی طرف منتقل ہو گئی ، شاید اس معذرت کے بعد میری اس جسارت کو دخل در معقولات سے تعبیر نہ کیا جائے گا ،

ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے کاہی کی جائے پیدائش میاں کال بتائی ہے ، جو سمرقند و بخارا کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ ہے ، فرماتے ہیں :

Abdul Qasim-i-Kahi was born c. 868
at Mian kal, a hilly tract between
Samarqand and Bukhara

ڈاکٹر نذیر صاحب کو اس سے انکار ہے ، وہ فرماتے ہیں :

"کاہی کا وطن اور مولد کوفن کے بجائے میاں کال قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا"

ان دونوں قولوں میں صحیح کون ہے اور غلط کون اس کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا ، البتہ ایک چیز اسی منزل میں طے ہو گئی کہ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا قول صحیح ہو یا غلط مگر انداز بیان قطعی ہے کہ "قاسم کاہی میاں کال میں پیدا ہوا تھا" اس کے برخلاف ڈاکٹر نذیر صاحب کے قول میں تذبذب و اضطراب ہے ، وہ نہ قطعیت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ قاسم کاہی "میاں کال میں پیدا نہیں ہوا تھا" اور نہ حتمی طور پر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ "کوفن ہی میں پیدا ہوا تھا" کیونکہ مضمون کی دوسری قسط میں ان کا رجحان عرفات العاشقین کی تصویب کی جانب معلوم ہوتا ہے جس میں لکھا ہے :

"مولدش قلعہ کاہ ست و بست (سبب ؟) تخلص ہماں است" .

میں نے اگست و ستمبر کے معارف بار بار پڑھے لیکن میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ قاسم کاہی کے وطن کے باب میں خود ڈاکٹر نذیر صاحب کی کیا رائے ہے ، آیا وہ کوفن کو سید مشار الیہ (یعنی کاہی) کی جائے ولادت سمجھتے ہیں ، جیسا کہ تقی کاشی نے خلاصۃ الاشعار میں لکھا ہے یا اسکا مولد قلعہ کاہ کو سمجھتے ہیں ، جیسا کہ تقی اصفہانی نے عرفات العاشقین میں لکھا ہے ، مجھے اپنی کوتاہی فہم اور نارسائی کا اعتراف ہے کہ میں بار بار ان کے قابل قدر مقالے کو پڑھنے کے باوجود یہ نہ سمجھ سکا کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں ،

اگر ڈاکٹر نذیر صاحب خلاصۃ الاشعار پر اعتماد کرتے ہیں کہ کاہی کا وطن کوفن تھا تو پھر ڈاکٹر ہادی حسن صاحب پر یہ اعتراض کیوں ہو کہ وہ عرفات العاشقین کے اس بیان کو کہ "کاہی کا مولد قلعہ کاہ ہے" ، غلط قرار دیتے ہیں ، اور اگر وہ اسے رد نہ کرتے تو وطن کے سلسلے میں ان کا مفروضہ غلط ہو جاتا ، ظاہر ہے اگر کاہی کی جائے ولادت کوفن ہو تو قلعہ کاہ والی حکایت کو رد کرنا ہی پڑے گا . خواہ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب رد کریں یا

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اور اگر اس کی جائے پیدائش قلعہ کاہ ہو تو کوفن والا قول ترک کرنا پڑے گا،

اس لیے اس عاجز کے خیال میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے قول میں تذبذب و اضطراب ہے اور یہ تحقیق نہیں تشکیک ہے، ہمارا خیال تھا کہ وہ کثیر المطالعہ محقق ہیں اور ان کی رسائی بعض ایسے مخطوطات تک ہوئی ہے جن کی طرف ڈاکٹر ہادی حسن کی توجہ نہ ہوئی ہو [وہ مشہور تذکرہ خلاصۃ الاشعار ہے] اور انھوں نے بڑی توجہ سے دیگر تذکروں کے بیانات کو بھی پیش نظر رکھا ہوگا، "جن کو ڈاکٹر ہادی حسن نے نظر انداز کر دیا ہے یا غلط قرار دیا ہے"۔ اس وسعت مطالعہ کے بعد انھیں چاہیے تھا کہ وہ ان باہم دست و گریباں بیانات میں محاکمہ کرتے، ہو سکتا تو ان میں تطبیق فرماتے، تطبیق نہ ہو سکتی تو تنقید کی کسوٹی پر ہر بیان کو کستے اور اس کے بعد قطعیت کے ساتھ ایک غیر مبہم رائے متعین فرماتے،

ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی رائیں غلط ہوں، مگر وہ قاری کو خلجان و تذبذب میں نہیں چھوڑتے، ہر باب میں انھوں نے ایک قطعی اور فیصلہ کن رائے دی ہے، اگر یہ رائیں غلط تھیں تو ایک صاحب النظر نقاد کی حیثیت سے ڈاکٹر نذیر صاحب کا فرض تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی جس رائے کی تضعیف کرتے، اس کے مقابلے میں اپنی رائے بھی قطعیت کے ساتھ دیتے۔

بہرحال اس سلسلے میں چار مسئلے پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ آیا قاسم کاہی میاں کال میں پیدا ہوا تھا، جیسا کہ ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا خیال ہے،

ب۔ یا وہ کوفن میں پیدا ہوا تھا، جیسا کہ ڈاکٹر نذیر صاحب نے خلاصۃ الاشعار کے

حوالے سے لکھا ہے،

ج۔ یا وہ قلعہ کاہ میں پیدا ہوا تھا جیسا کہ ڈاکٹر نذیر صاحب نے عرفات العاشقین کے حوالے سے لکھا ہے،

د۔ وہ "میاں کالی" (میاں کالا والا) تھا یا "میاں کالے" (Mr. Black)؟

یہ آخری سوال کوئی علمی مسئلہ نہیں، اس کی حیثیت لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی سے زیادہ نہیں، اور اس حیثیت سے وہ سنجیدہ تبصرے کا مستحق نہ تھا، مگر میرے محترم بزرگ جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی یو۔پی کو اس مسئلے سے بڑی دلچسپی ہے، ایک دن ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو فرمانے لگے کہ حافظ صاحب آپ کا موقف درست سہی لیکن آج بعض اکابر اہل فن سے جو فارسی ادبیات پر (authority) ہیں، اس سلسلے میں تبادلۂ خیالات ہوا تو وہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے نظریہ کی تصویب کر رہے ہیں، ان کی اس گفتگو نے صورت حال بالکل بدل دی، کیونکہ جہاں تک ڈاکٹر نذیر صاحب کا تعلق ہے ہم دونوں کی حیثیت محض "حریفان بادہ پیما" کی ہے، لیکن اکابر اہل فن مثلاً ڈاکٹر ہادی حسن صاحب یا مولانا ضیاء احمد صاحب کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے، ان کی ہر تصویب ہمارے لیے عین صواب ہے،

اس تصویب کے بعد اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، چنانچہ میں نے بھی خاموشی سے اس بحث کو جہاں تھی وہیں چھوڑا اور مزید کاوش و تحقیق کا ارادہ فسخ کر دیا،

بدایونی کی منتخب التواریخ بڑے کام کی اور دسویں صدی کے ہندوستان کی ذہنی و فکری حالت کا آئینہ ہے، یوں بھی میں اکثر اس کی ورق گردانی کرتا رہتا ہوں، ایک دن ورق گردانی کرتے کرتے ایک عجیب چیز نظر آئی، پہلے تو اسے اتفاق سمجھا، مگر

جتنا مطالعہ کیا معلوم ہوا کہ نہیں وہ ایک کلیہ ہے۔ بدایونی کی ایک خاص اصطلاحی زبان ہے، اور مدح و یا ذم وہ اس میں اسراف نہیں برتتے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چوتھے سوال کے ضمن میں ڈاکٹر نذیر صاحب کے استدلال کا جائزہ لے لیا جائے، فرماتے ہیں :-

(۱) "آئین اکبری میں عرف کا فقرہ کھٹکتا ہے، اور یہ نہ ہوتا تو "کالی" میں "یائے نسبت" زیادہ قرینِ صحت ہوتی،

(۲) دوسرے یہ کہ یہ عرف ہندوستان میں بہت عام ہے، یعنی اس "ی" کو معروف کے بجائے مجہول پڑھیے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ منتخب التواریخ میں بدایونی نے قاسم کاہی کا عنوان قائم کرکے "میاں کالے" کے نام سے اس کا بیان شروع کیا ہے، اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ میاں کالے اس کا عرف تھا، اس لیے اس کو کسی مقام کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہو سکتا،

(۴) چوتھے یہ کہ خلاصۃ الاشعار کا بیان نہایت واضح ہے، اس میں صراحۃً نہ صرف اسکا وطن دیا ہے بلکہ اس کے اجداد کے...... کو فن میں سکونت پذیر ہونے کا بھی بیان ہے۔"

اس میں سے پہلی دلیل کے بارے میں نہایت ادب سے عرض ہے کہ ڈاکٹر نذیر صاحب کو تو عرف کا فقرہ کھٹکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اردو میں عرف سے "علم کی وہ قسم مراد ہوتی ہے جو یوں ہی مشہور ہو جائے۔" لیکن فارسی میں اس نئے مفہوم سے کوئی واقف نہیں، کیا اچھا ہوتا اگر ڈاکٹر نذیر صاحب اس استدلال سے پیشتر فرہنگ آنند راج کو دیکھ لیتے۔

"عرف بالضم شناختہ و نیکوئی و جوانمردی و سخاوت و دہش و نام انچہ بذل و بخشش کردے و موج دریا و شناختگی ضد النکر" الخ

لغت کی اس تصریح کے بعد عرف کے جو معنی یہاں لیے جا سکتے ہیں وہ ہیں "شناختہ" اسلیے آئین اکبری کے فقرے "قاسم کاہی عرف میاں کالی" کے معنی ہوئے "قاسم کاہی جو میاں کالی کے نام سے پہچانا جاتا تھا" یا "قاسم کاہی جو میاں کالی والے کی نسبت سے پکارا جاتا تھا"، اور یہی مفہوم "ڈاکٹر ہادی حسن صاحب اور ان سے پہلے بلوخمین نے سمجھا ہے،

دوسری دلیل کا جواب بھی اس میں آگیا، حقیقت یہ ہے کہ آج عرف کا جو مفہوم رائج ہے وہ نیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اردو کا ہے، فارسی میں اس کا یہ مفہوم نہیں، حتیٰ کہ فرہنگ آنند راج کے زمانے میں بھی نہ تھا، ابوالفضل کا زمانہ تو اس سے کہیں زیادہ قدیم ہے، رہا ڈاکٹر نذیر صاحب کا یہ مشورہ کہ "ی کو معروف کے بجائے مجہول پڑھیے" کچھ زیادہ صائب نہیں ہے، اس سے بات صاف تو کیا ہوگی مجھے اندیشہ ہے، بالکل مہمل ہو جائے گی، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے،

تیسری دلیل کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ میرے سامنے منتخب التواریخ کا وہ ایڈیشن ہے جو کلکتہ میں ۱۸۶۹ء میں چھپا تھا۔ اس کے صفحہ ۱۷۲ پر (جس کا ڈاکٹر نذیر صاحب نے حاشیہ میں حوالہ دیا ہے) بدایونی نے قاسم کاہی کا عنوان قائم کرکے "میاں کالی کابلی" کے نام سے اس کا بیان شروع کیا ہے۔ یعنی "میاں کالی" (بیائے معروف) لکھا ہوا ہے، معلوم نہیں ڈاکٹر نذیر صاحب نے اسے کس طرح "میاں کالے" (بیائے مجہول) پڑھ لیا ہے" اگر کسی اور نسخہ میں انھیں بیائے مجہول ملا تھا تو انھیں اس کا حوالہ دینا چاہیے تھا، کلکتہ کے ۱۸۶۹ء والے اڈیشن کے صفحہ کا حوالہ کیا معنی، لیکن اگر کسی مخطوطہ میں بیائے مجہول ہو تو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ قدیم کاتبین یائے معروف و مجہول کے استعمال میں اردو و فارسی کے موجودہ رسم الخط کا التزام نہیں کرتے تھے۔

چوتھی دلیل پر مفصل تبصرہ دوسرے سوال کے ضمن میں آئے گا، اس کا ماحصل یہ ہے کہ نقی کاشی کی یہ صراحت کہ "سید مشارٌ الیہ در کوفن ..... متولد شدہ" اس بات کے منافی نہیں ہے کہ کاہی میاں کال میں پیدا ہوا ہو، لیکن ان دونوں قولوں میں تطبیق وہی کر سکتا ہے جو ممالک اسلامیہ کے قدیم جغرافیہ پر پوری نگاہ رکھتا ہو،

اس سوال پر تبصرہ ختم کرنے سے پیشتر دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

ا۔ اگر علی سبیل التنزل یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ڈاکٹر نذیر صاحب کی Reading ہی صحیح ہے یعنی یہ کہ "میاں کالی" نہیں بلکہ "میاں کالے" [الشیخ الاسود یا Mr. Black] ہے تو قرائن اس مفروضہ کے منافی ہیں جس کی تفصیل یہ ہے:-

کاہی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا تھا، خواہ ایران میں پیدا ہوا ہو یا توران میں یا افغانستان میں، کم از کم ہندی نژاد نہیں تھا، وہ ایک نووارد ایرانی تھا، جو ۹۶۱ھ میں ترانوے سال کی عمر میں شمالی ہندوستان میں آیا تھا جب کہ اس کا عَلَم، کنیت، عرف، لقب اور تخلص وغیرہ سبھی پختہ ہو چکے تھے، اس لیے اگر "میاں کالے" اس کی عرفیت تھی جیسا کہ ڈاکٹر نذیر ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں تو ہندوستان آنے سے قبل بلکہ غالباً کابل پہنچنے سے بھی پہلے پڑ چکی تھی، مگر اس قسم کا عرف ہندوستان میں عام ہو تو ہو، ماوراء النہر یا خراسان میں جو اس کا مولد و منشا تھا، نہ اس قسم کی عرفیت کا رواج تھا اور نہ اس کی کوئی مثال ملتی ہے،

ب۔ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ منتخب التواریخ کے مطالعہ میں مجھے ایک کلیہ ملا وہ یہ کہ بدایونی کی ایک اصطلاحی زبان ہے، اور مدح ہو یا ذم وہ اس کے استعمال میں اسراف نہیں برتتے، مثلاً علمائے معقول کے لیے وہ ملا کا لفظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً

"ملا پیر محمد شیروانی ملائے خوش فہم اعلیٰ ادراک بود" [منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۱۵۶]

علمائے معقول و منقول کے لیے وہ مولانا کا لفظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً

"مولانا عبد اللہ سلطانپوری ...... از فحول علمائے زمان و یگانۂ دوراں بود خصوصاً در عربیت و اصول، فقہ و تاریخ و سائر نقلیات صاحب تصانیف لائقہ رائقہ است"۔ (ایضاً ص ۷)

مشائخ و صوفیہ کے لیے وہ شیخ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً

"شیخ سلیم چشتی از اولاد مخدوم شیخ فرید گنج شکر قدس اللہ روحہ۔ اصل او از دہلی است و نسبت انابت و بیعت بخواجہ ابراہیم دارد"۔ (ایضاً ص ۱۱)

چوتھا لفظ "میاں" ہے، اور بدایونی "میاں" کا لفظ استعمال کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتتے ہیں، انھوں نے علماء و مشائخ میں سے صرف ان ہی نفوس قدسیہ کو اس لفظ کا مستحق سمجھا جو "ملائک بلباس بشر" اور خلوص مجسم تھے، مثلاً

۱۔ "میاں حاتم سنبلی قدس اللہ سرہٗ ...... صاحب کمالات صوری و معنوی است، در حین تحصیل علم حال برو غالب آمد و ترک قیل و قال کردہ ارادہ باستاذ خود شیخ عزیز اللہ دانشمند طلبنی کہ از علمائے باللہ و مشائخ مقتدائے روزگار است آورد ...... حضرت شیخ در سنہ نہصد و شصت و نہ (۹۶۹) بجوار قرب ایزدی واصل شد درویش دانشمند تاریخ او ست طیب اللہ ثراہ"۔ (ایضاً ص ۲ - ۳)

۲۔ "میاں حاتم سنبلی شاگرد میاں عزیز اللہ طلبنی است"۔ (ایضاً ص ۶۶)

۳۔ "میاں شیخ محمد امر با حضار راحضر بجہت عامہ کس فرمودند و من ہر زماں بوسیلۂ میاں شیخ محمد جہت گرفتن رخصت مضطرب بودم"۔ (ایضاً ص ۱۹)

۴۔ "روزے در وقت وداع بوسیلۂ میاں عبد الوہاب کہ از مخلص اصحاب طوبیٰ لہم و حسن مآب بود، عرض کردم"۔ (ایضاً ص ۳۵)

۵- "زمانے کہ فقیر از ملازمت حضرت میاں شیخ داؤد قدس اللہ سرہ العزیز از پنجاب بازگشتہ۔" (ایضاً ص ۳۹)

۶- "میاں وجیہ الدین از علمائے کبار روزگار و صاحب صلاح و تقوی و مجاہدہ است و بر جادۂ شریعت مستقیم و در گوشۂ قناعت مقیم - دائم بدرس علوم دینی اشتغال داشت" (،، ص ۴۳)

۷- "میاں عبد اللہ نیازی سرہندی در سنہ نود سالگی در سنہ (۱۰۰۰) ہزار ازیں سرائے مستعار رخت در جوار حضرت پروردگار عزشانہ برد- اسکنہ اللہ فی اعلیٰ علیین۔" (،، ص ۴۶-۴۷)

۸- "شیخ ابو اسحٰق لاہوری از خلفاے حضرت شیخ میاں داؤد قدس اللہ سرہ است..... گرد حدوث و غبار ارکان بر دامن ہمتش اصلا ننشستہ بمجرد دیدنش یاد خداے عز و جل بر ہر دل سیاہ غافل پر تو می انداخت...... میگفتم کہ از خدمت میاں شیخ ابو اسحٰق بملازمت حضرت پیر دستگیر رحمہما اللہ می روم۔" (ایضاً ص ۴۸)

۹- "میاں مصطفیٰ گجراتی...... طریقۂ فقر و فنا پیش گرفتہ تا آخر عمر دراں وادی استقامت ورزید۔" (ایضاً ص ۵۰)

۱۰- "میاں شیخ عبد اللہ بداونی از حسنات زمانہ و برکات روزگار است..... و مردم اطراف و اکناف از اقصی ولایات بملازمت شریفش رسیدہ بسعادت جاودانی می رسیدند و در آواخر حال جذبہ برو غالب آمد۔" (ایضاً ص ۵۴-۵۵)

۱۱- "نعمت علم از اکثر مقتدایان روزگار خویش یافت خصوصاً از میاں شیخ لادن دہلوی و میر سید جلال بداونی۔" (ایضاً ص ۵۵)

۱۲- "میاں جمال خان مفتی دہلی...... اعلم العلماے زمان خود بود...... بخانۂ ملوک و سلاطین نرفتے و پیوستہ نزد حکام معزز و محترم بودے۔" (ایضاً ص ۷۷)

۱۳- "میاں الہداد لکھنوی از دانشمنداں مستعد صاحب تصرف بود۔" (ایضاً ص ۸۵)

۱۴- "میاں کمال الدین حسین شیرازی خود ملکے است بصورت بشری جلوہ گر شدہ و اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدۂ او از دائرۂ تحریر و تقریر بیرون است۔" (ص ۱۲۷)

میں نے ان تمام بزرگوں کا استقصا کرنے کی کوشش کی ہے جن کا ذکر بدایونی نے "میاں" کے نام سے کیا ہے۔ ممکن ہے کوئی نام رہ گیا ہو، مگر اتنا یقینی ہے کہ یہ تمام نفوس قدسیہ بدایونی کی نظر میں زہد و تقوی کا مجسمہ تھے۔ جب وہ ان کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ادب احترام اور خلوص و عقیدت کے جذبے سے سرشار ہیں، جیسا کہ اقتباسات بالا سے ظاہر ہے، اس کے مقابلے میں قاسم کاہی کے متعلق بدایونی کے ارشادات ملاحظہ ہوں:-

"اگرچہ صحبت مشائخ متقدمین و زمان مخدومی مولوی جامی قدس سرہٗ وغیر ایشان را دریافتہ اما ہمہ عمر بالحاد و زندقہ صرف کردہ۔" (ایضاً ص ۱۷۳)

اس کی بد دینی و خبث اعتقاد سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں کہ میں تو صرف اسے بحیثیت شاعر جانتا ہوں:-

"مارا بمذہب او ہیچ کار نیست ایں چند شعر از نقل نمودہ می آید۔" (ایضاً ص ۱۷۳)

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بدایونی کو کاہی کے الحاد و آزاد مشربی سے سخت نفرت ہے، اور اسے شعراے معاصرین کے الحاد و زندقہ کا سر چشمہ سمجھتے ہیں:-

"تمامی شعراء عصر کلہم و جلہم، صغیرہم و کبیرہم مگر سہ چہار نفر از قدماے عمر جو رتی حیدری مشرب اند اما ایں ہر دو (غزالی و قاسم کاہی) مقتدا و پیشواے ہمہ بودند کہ در اشاعت خباثت را باتباع و اشیاع خویش بقدر مناسبت و استعداد ذاتی و فیض صحبت گزشتہ تقسیم کردند۔" (ایضاً ص ۱۷۶)

کیا اس کے بعد بھی اس کا احتمال رہ جاتا ہے کہ بدایونی نے ایسے "ملحد و بددین" کا "میاں" کے احترامی لقب سے ذکر کیا ہو جس سے وہ صرف ان نفوس قدسیہ کو ملقب کرتے ہیں، جن سے کمال درجہ خلوص و عقیدت ہے۔ اگر ڈاکٹر نذیر صاحب اس قیاس آرائی سے پہلے بدایونی کے انداز نگارش کا تفصیلی مطالعہ فرما لیتے تو غالباً اس قسم کی نظریہ تراشی کی زحمت گوارا نہ فرماتے۔

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب افقر موہانی وارثی

خرد ہے مجبور، عقل حیراں، پتہ کہیں ہوش کا نہیں ہے
ابھی سے عالم ہے بیخودی کا ابھی تو پردہ اٹھا نہیں ہے

نفس نفس اک نئی ہے دنیا، نظر نظر اک نیا ہے جلوہ
نگاہ کی پھر بھی انتہا ہے، جمال کی انتہا نہیں ہے

ہے وہ بھی کوئی جبین سجدہ اٹھے تمھارے جو نقش پا سے
نہ جذب کرلے اگر جبیں کو تمھارا وہ نقش پا نہیں ہے

ازل سے ہے آسماں خمیدہ نہ کر سکا پھر بھی ایک سجدہ
وہ ڈھونڈھتا ہے جس آستاں کو وہ آستانہ ملا نہیں ہے

رے نظامِ حیات میں کچھ کمی سی محسوس ہو رہی ہے
مگر ہو تم کس لیے پریشاں سوال دل کا اٹھا نہیں ہے

ہزار رنگِ زمانہ بدلے، ہزار دورِ نشاط آئے
جو بجھ چکا ہے ہوائے غم سے چراغ وہ پھر جلا نہیں ہے

ہوا یہ معلوم بعد مدت کسی کی نیرنگیٔ ستم سے
ستم باندازۂ ادا ہے، ادا بقدرِ جفا نہیں ہے

بہار آنے کی آرزو کیا، بہار خود ہے نظر کا دھوکا
ابھی چمن جنتِ نظر ہے، ابھی چمن کا پتہ نہیں ہے

خوشی ہے زاہد کی ورنہ ساقی خیال توبہ رہیگا کبتک
کہ تیرا رندِ خراب افقر ولی نہیں پارسا نہیں ہے

غزل

از جناب صدیق حسن صاحب، ممبر بورڈ آف ریونیو، یوپی گورنمنٹ

انداز خرام ناز میں ہے، کیفیت شام میخانہ — مخمور نگاہی پر نازاں، ہر دور ساغر و پیمانہ
پھر رحمت خاص ہی جنبش میں، پھر عرش کے پائے ہلتے ہیں — مسجود ملائک آیا ہے، لغزش کا لے کر نذرانہ
سایے میں گھنیری پلکوں کے، وہ بوجھل نظریں اٹھ اٹھ کر — پھر یاد دلاتی جاتی ہیں اک بھولا بھولا افسانہ
کیا رسم وفا سے بیگانہ ہو جائیگا عالم کا عالم — کیا ساتھ نہ دیگی عشرت غم اے گردش چشم جانانہ
کیوں دمکا دمکا مکھڑا ہے، کیا شعلہ کوئی بھڑکا ہے — یا صرف فروغ صہبا ہے، اے چشم و چراغ میخانہ
تھا عشق بلا پیشہ آذر اور اس پر میرا ذوق نظر — دونوں نے بنا ڈالا ملکر اس کعبۂ دل کو بتخانہ

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

یہ طالبانِ دید کو اب تک خبر کہاں — جلوے تو ہر طرف ہیں شعور نظر کہاں
وہ سامنے ہیں پھر بھی مجالِ نظر کہاں — ہر چند ہوش میں ہوں مگر اسقدر کہاں
دل کو سکوں نصیب یہاں لمحہ بھر کہاں — دنیائے حادثات میں غم سے مفر کہاں
جب ہر نفس تھا میرا غریقِ خیالِ دوست — یارب وہ میری شام وہ میری سحر کہاں
یہ رازِ عاشقی ہے یہاں ہے جنوں سے کام — اہل خرد کی بات یہاں معتبر کہاں
آج اِس جگہ قیام ہے کل اُس جگہ قیام — آوارگانِ عشق کا دنیا میں گھر کہاں
آساں نہیں ہے موج و تلاطم سے کھیلنا — ساحل پہ رہنے والوں کو اسکی خبر کہاں
دنیا تو آج بھی ہے مگر اے مرے ندیم — پہلی سی اب بشر میں وہ شانِ بشر کہاں
اپنی تمام عمر شبِ غم میں کٹ گئی — جوہر مرے نصیب میں لطفِ سحر کہاں

مطبوعات جدیدہ

صدیق اکبرؓ - از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۶، غیر مجلد ۵، پتہ ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

اسلام کی راہ میں جس طرح عہد نبویؐ میں سب سے زیادہ خدمات حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہیں، اسی طرح آپ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ میں بھی سب سے زیادہ کارنامے ان ہی نے انجام دیے، یہ اور بات ہے کہ جن لوگوں کی نظر اس دور کی تاریخ پر گہری نہیں ہے، ان کو عہد فاروقی کے عظیم الشان اور گوناگوں کارناموں کے مقابلہ میں عہد صدیقی ہلکا نظر آتا ہے، ورنہ درحقیقت عہد فاروقی میں جو کارنامے انجام پائے انکی بنیاد بھی حضرت ابو بکرؓ ہی نے رکھی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو ان ہی نے سنبھالا، یہ ایسا نازک دور تھا کہ سارے عرب میں انقلاب بپا ہو گیا تھا، ایک طرف جھوٹے مدعیانِ نبوت اسلام کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے، دوسری طرف عرب کے قبائل کچھ مرتد اور کچھ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے، شام کی سمت سے سرحدی امراء کے حملہ کا الگ خطرہ تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب نبوت کی روپوشی کے ساتھ ہی اسلام کا چراغ بھی گل ہو جائے گا، ان حالات نے بڑے بڑے صحابہ کو گھبرا دیا تھا، اور کوئی تدبیر ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی، حضرت عمرؓ جیسے مستقل مزاج تک جیش اسامہ کی روانگی اور منکرین زکوٰۃ پر تلوار اٹھانے کے خلاف تھے، اس موقع پر تنہا ابو بکر صدیقؓ کی دینی بصیرت اور ہمت و استقلال نے ان حالات کا مقابلہ کیا اور تمام مخالف طاقتوں کو زیر کر کے دوبارہ اسلام کے قدم جمائے، عرب کے اندرونی انقلاب سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد عربوں کی پرانی دشمن ایران و روم کی حکومتوں کے خطرات کا جن کی دشمنی

ظہور اسلام کے بعد اور بڑھ گئی تھی، انسداد کیا، اس سلسلہ میں عراق و شام کی فتوحات کا دروازہ کھلا اور جو قومیں عربوں کو حقیر سمجھتی چلی آرہی تھیں، ان کو ان کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا، انتظامی حیثیت سے خلافت راشدہ کا ڈھانچہ قائم کیا، اس زمانہ میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان کو اپنی دینی و سیاسی بصیرت سے حل کیا، انکے علاوہ مختلف قسم کے دینی، علمی اور اخلاقی کارنامے انجام دیے، کلام مجید کو جس کی ترتیب عہد نبوی ﷺ میں ہو چکی تھی مگر کتابی صورت میں مدون نہ ہوا تھا اور اس کے اجزا منتشر تھے، صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کرایا، جملہ امور میں اسلامی روح کو پوری طرح برقرار رکھا، کسی معاملہ میں طریق نبوی ﷺ سے تجاوز نہ کرتے تھے، غرض خلافت راشدہ کی تشکیل کی راہ کی تمام مشکلات کو دور کرکے اس کا ایسا نمونہ قائم کر دیا جس کی بنیاد پر خلافت فاروقی کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا، مولانا شبلی نے الفاروق لکھکر حضرت عمر رضی کا تو حق ادا کر دیا تھا، مگر ابوبکر صدیق رضی کا حق ابھی باقی تھا، ہمارے فاضل دوست مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے یہ کتاب لکھکر اس حق کو ادا کیا ہے، وہ ایک وسیع النظر فاضل اور پختہ کار صاحب قلم ہیں، اس لیے انھوں نے اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیق رض کے ذاتی حالات و سوانح، اخلاق و سیرت، فضل و کمال، اجتہاد و تفقہ، ان کے اسلامی خدمات، علمی، دینی، سیاسی اور انتظامی کارناموں وغیرہ، ابوبکر صدیق رض کی شخصیت اور عہد صدیقی کے تمام پہلوؤں پر اس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے کہ اس کا ہر رخ سامنے آجاتا ہے اور حضرت صدیق اکبر رض کی عظمت اور ان کے کارناموں کی اہمیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، کتاب میں جابجا علمی و دینی مباحث اور بعض قابل تحقیق سیاسی و تاریخی مسائل پر سیر حاصل بحثیں ہیں، ان مسائل میں اگرچہ فاضل مصنف کی ہر تحقیق اور رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے، لیکن یہ بحثیں نہایت قابل قدر اور فاضل مصنف کی تحقیق اور دقت نگاہی کی آئینہ دار ہیں، مجموعی حیثیت سے کتاب نہایت مبسوط و محققانہ اور عہد صدیقی کا جامع مرقع ہے اور الفاروق کی تصنیف کے بعد سیرۃ الصدیق کی جو کمی محسوس ہوتی تھی، وہ اس سے پوری ہوگئی،

آشفتہ بیانی میری - از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ے/ غیر مجلد ؏ پتہ سرسید بک ڈپو شمشاد مارکیٹ علی گڈھ

یہ کتاب مصنف کے قلم سے ان کی سرگذشت ہے، جو علی گڈھ میگزین کے خاص نمبروں میں شائع ہو چکی ہے، اب اس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، ان کی ابتدائی تعلیم ان کے وطن جونپور میں ہوئی، اور اسکی تکمیل علی گڈھ کالج میں، وہ اس زمانہ میں علی گڈھ پہنچے تھے جب اس کی پرانی روایات قائم تھیں، اور کالج محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیبی روایات اور ملی خصوصیات کا بھی مرکز تھا، اس کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے نمونہ سمجھے جاتے تھے، جو سکہ اس ٹکسال سے ڈھل کر نکلتا تھا وہ پورے اسلامی ہند میں چل جاتا تھا، اس زمانہ اور اس ماحول میں رشید صاحب کی نشو و نما ہوئی، اور ان کی شخصیت بنی، حصول تعلیم کے بعد بھی بحیثیت معلم کے انکی پوری زندگی علی گڈھ میں گذری، اور اس کے چالیس سالہ تغیرات کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، اس لیے وہ گویا علی گڈھ کی زندہ تاریخ ہیں، اور ان میں علی گڈھ اسقدر رچ بس گیا ہے کہ وہ خود اس کا مجسم پیکر بن گئے ہیں، اس لیے ان کی زندگی کا جو رخ بھی سامنے آئیگا اس میں علی گڈھ کا عکس ضروری ہے، اسی لیے ان کی کم تحریریں اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی ہیں، اور یہ کتاب تو ان کی سرگذشت ہے، اس لیے وہ قدرۃً علی گڈھ کی تاریخ بن گئی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس دلکش داستان کو ان سے بہتر دوسرا بیان بھی نہیں کر سکتا۔

داستانِ عہد گل را از نظیری می شنو

عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

چنانچہ اس میں نظیری کا حسن بیان بھی ہے اور عندلیب کی شیفتگی بھی، مگر عندلیب علی گڈھ کی یہ داستان سرائی آشفتہ بیانی نہیں بلکہ علی گڈھ کے عہد گل کا ایسا بوقلموں مرقع ہے، جس سے اس کی زندگی کا ہر رخ، اس کی جملہ تعلیمی و تہذیبی خصوصیات، اس کے مختلف النوع کارنامے، اسکے چالیس سالہ

واقعات وحوادث کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ امتداد زمانہ سے علی گڈھ کی پرانی خصوصیات بہت کچھ پہلے ہی مٹ چکی تھیں، اب نئے حالات میں اس کے باقی آثار کا قائم رہنا بھی مشکل ہے، رشید صاحب نے یہ کتاب لکھکر علی گڈھ مرحوم کا ایک ایسا جاندار مرقع تیار کر دیا ہے جس میں اسکے تمام اصلی خط وخال نمایاں ہیں اور اس آئینہ میں اسکی پرانی تصویر ہمیشہ نظر آتی رہے گی جس سے موجودہ اور آیندہ نسلیں بہت کچھ سبق حاصل کر سکتی ہیں، ممکن ہے مصنف کے بعض خیالات ہر شخص کے لیے قابل قبول نہ ہوں لیکن سعادتمند نوجوانوں کے لیے "اس پیر دانا" کی بہت سی باتیں قابل غور ہیں، جو نبور کے اس دور کی سوسائٹی کا بھی بہت دلچسپ نقشہ کھینچا ہے، جو منظر بھی دکھایا ہے اسکی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ امید ہو کہ یہ کتاب نہ صرف علی گڈھ کے قدر دانوں بلکہ عام اصحاب ذوق میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی،

مجذوب اور انکا کلام - مرتبہ مولوی محمد رضا صاحب انصاری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ (۱) فرنگی محل کتاب گھر لکھنؤ (۲) ایوان ادب لاٹوش روڈ لکھنؤ

خواجہ عزیز الحسن غوری مرحوم المتخلص بہ مجذوب بڑے پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے، ان میں چشتیت کا اتنا غلبہ اور اس کی اتنی مستی و سرشاری تھی کہ وہ حقیقۃً مجذوب کہلانے کے مستحق تھے، اسی لیے ان کے کلام میں بھی بڑا سوز و ساز اور کیف و مستی ہو، اور اس حیثیت سے وہ اردو کے حافظ اور خسرو کہے جاسکتے ہیں، کئی سال ہوئے انکے کلام کا ایک مجموعہ کشکول مجذوب کے نام سے سہارنپور سے شائع ہو چکا ہے، مگر اسمیں رطب یابس کا امتیاز نہیں کیا گیا ہو، اسلیے ہمارے محترم عزیز مولوی محمد رضا فرنگی محلی نے جنکو کلام مجذوب سے بڑا شغف ہو اسکا یہ انتخاب مرتب کیا ہو اور اسکے شروع میں انکے قلم سے مجذوب صاحب کی شخصیت اور انکے کلام کی خصوصیات پر جامع تبصرہ ہے، راقم کا ایک مضمون بھی جو آج سے دس بارہ سال پہلے معارف میں شائع ہوا تھا، اس مجموعہ میں شامل کر کے ایک بدذوق کو نیولگا کر شہیدوں میں داخل کر لیا گیا ہو، ان دونوں مضامین سے خواجہ صاحب اور انکے کلام دونوں کی خصوصیات ظاہر ہو جاتی ہیں، جو لوگ اردو میں خواجہ حافظ اور خسرو کے رنگ سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں انکو اس انتخاب لاجواب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے،

م